چار اسلام

دفتر سوئم

ارشادات گرامی حضرت بابا قادرؒ اولیاء
وزیانگرم جنوبی ہند



محمدؐ عبید اللہ درّانی

ملنے کا پتہ
''العبید'' 335-D/1 نیسپاک ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

خالی

چار اسلام

فہرست مضامین

	پیش لفظ	۷
باب۱	اسلام دین فطرت	۴۱
باب۲	ارتقائے اسلام	۲۳
باب۳	ابراہیمی اسلام	۶۱
باب۴	موسوی اسلام	۷۱
باب ۵	عیسوی اسلام	۹۴
باب ۶	نزول رحمت،رحمت الاللعالمینؐ	۱۰۸
باب ۷	اسلام الاسلام	۱۱۹
باب ۸	میں کیا کروں	۱۵۲

☆☆☆☆

خالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معروضات

دفتر اول حیاتِ قادر کے بعد ارشادات بابا قادراولیاءؒ پر مبنی دفتر دوم کُن فیکُون اور دفتر سوم چار اسلام ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جا چکے ہیں۔

ان کتب کی افادیت اور طالبین کے اصرار پر ان کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا حیات قادر کے دفتر سوم چار اسلام کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے۔

حیات قادر اگر منبعِ نور تک رسائی کا ذریعہ ہے تو کن فیکون ایک عالم نورانی میں کسی قدوسی روح کے غرق صفات و ذات ہو جانے اور نور دو عالم کو اپنے میں سمو لینے کا موجب بنتی ہے۔ پھر اس عروج کے بعد ہی کہیں عالم خلق میں واپسی اور توحید تخلیق، دین فطرت کو عالم انسانیت میں نشر کرنے کا حق ادا کرنا، فقر کیلئے شرف و فضیلت کا باعث بنا کرتا ہے۔

لیکن عالمی سطح پر بھی نشر فیض کی اہمیت کے پیش نظر، قارئین سے گزارش ہے کہ چار اسلام کی معنویت کو نہ صرف اپنے بلکہ دوسرے مذاہب والوں کے سینوں میں اتاریں تاکہ وحدت دین فطرت میں الخلق عیال اللہ کا فرمان ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے۔ ممکن ہے کہ قارئین میں سے چند ایک اس جذبے سے سرشار ہو جائیں اور چار اسلام کے ترجمے ایسی زبانوں میں پیش کر دیں کہ زیادہ سے زیادہ عالم انسانیت اپنی مرکزیت نور کو پا کر اپنے لئے راہ حق کا تعیّن کرے۔ رحمتی وسع علی کل شیء

طالب کرم

ولی الدین

ستمبر ۱۹۸۶ء

خالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ط

پیش لفظ

اسلام تو ایک ہے پھر چار کیوں۔؟ یہ ایک کھلا سوال ہے۔ اس تجزیہ کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اسلام کے فطری ارتقائی منازل کو پیش کرتے ہوئے اس کی یکتائیت کی وضاحت کر دی جائے۔ وسیع تر معانی میں مذاہب عالم کی تعداد خاصی ہے۔ اور ان میں سے ایک ایک کو اپنی سچائی اور یکتائی پر اصرار ہے۔ اندریں حالات اسلام کو ایک اور منفرد مذہب کی طرح پیش کرنا الجھی ہوئی صورت حال کو مزید الجھانے کے سوا اور کیا ہے! رسول اللہؐ نے فرمایا:

"کُلُّ مَوْلُوْدٍ عَلٰی فِطْرَۃِ الَّتِیْ فِطْرَۃ اللّٰہِ النَّاسِ عَلَیْھَا"

''یعنی ہر بچّہ اسی فطرت پر پیدا ہوتا ہے جس پر اللہ تعالےٰ
نے تمام بنی نوع انسان کو پیدا کیا ہے''

یہ ارشاد کس قدر واضح ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے۔ دیگر تمام اہل کتاب مذاہب اسی ایک دین فطرت کی ارتقائی کڑیاں ہیں۔ روز ازل تو تمام ارواح نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔ اب اگر کوئی اس دنیا میں انکار کرتا ہے تو وہ اصل میں دنیاوی آلودگیوں کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ اسلام ایک بنیادی حقیقت اور فعالی قوّت کے طور پر ہمیشہ

سے قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

دین الاسلام کے طویل اور پر پیچ سفر میں ان چار روشنی کے میناروں کا انتخاب صرف اس لئے کیا گیا ہے کہ اس گرد و غبار ہستی میں، اپنی راہ آسانی سے دکھائی دے اور ہم ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جائیں۔

1- دینِ ابراہیمی

2- دینِ موسوی

3- دینِ عیسوی اور

4- الاسلام میں اسی تدریجی ارتقاء کی نشاندہی کی گئی ہے جو پھیل پھیل کر ظاہر حیات اور ماحول پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس تحریک میں جہاں کہیں بھی ٹھہراؤ آیا، جس قدر جمود کی سی کیفیت پیدا ہوئی، انسانیت کا ہر پہلو اسی نسبت سے متاثر ہوا۔ اس کی تصدیق قرآن و دیگر صحائف آسمانی میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں تاریخی اعتبار سے بھی یہ درست ہے۔ مختلف زمانوں میں قوموں کی تاریخ ایسے بیشمار واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں باطن اور ظاہر کی کشمکش تباہی اور بربادی لائی مگر دین فطرت کا قافلہ ''فَاعْتَدِلُوْ'' کی نوائے جرس پر رواں دواں رہا اور انبیائے کرام مشعل ہدایت لئے آئندہ منزلوں کی نشاندہی کرتے رہے، تا آنکہ ''الاسلام'' کی منزل حُسن تک آن پہنچے۔ قافلہ چلا جا رہا ہے، کچھ راہوں میں پڑے ہیں، کچھ بڑھ رہے ہیں۔ ان قافلوں کے نشانات کی روشنی میں اگر ہم عصر حاضر کے کاروان کا جائزہ لیں تو جی بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

یہ حقیقت کسی ایک خاص مذہبی لبادے میں چھپے ہوئے طبقے پر ہی صادق نہیں آتی بلکہ اس کا اطلاق ان تمام داعیان حق پر ہوتا ہے جو بظاہر ہندو، بدھ، عیسائی، یہودی وغیرہ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ایک ہی سلسلہ دین اسلام کی کڑیاں ہیں اور مختلف باطنی سرحدوں پر

پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں۔ یہ بے راہ روی اور تشنگی، خمارِ نفس اور لطیفۂ نفس کا کرشمہ ہے یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں۔ نسل انسانی کے قافلے قطار اندر قطار، بار ہا اسی پر فریب وادی میں آن کر بھٹکے، اٹکے اور پھر ایسے بہکے کہ اپنا اول و آخر تک فراموش کر بیٹھے۔ بہت کم دل والے اس سراب سحر انگیز سے دامن بچا کر صاف نکل پائے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جو دین فطرت کے تدریجی ارتقاء اور اکملیت کے مظہر تھے وہ فریب خوردہ شاہین کی طرح کرگسوں میں پل کر، رہ و رسم شاہبازی ہی یکسر بھول گئے، فَاعْتَبِرُوْ یَااُوْلِی الْاَبْصَارط آج ہم اپنے گردوپیش پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالیں تو یہ حقیقت ذہن کے تنگ دریچوں سے گھر کر ہر ایک ہاتھ میں ہزار آئینے لئے ہمارا منہ چڑانے سامنے آن موجود ہوگی کہ صہیونیت نت نئے انداز اختیار کر کے بنی نوع انسان کو اپنے دام میں گرفتار کئے ہے اور اسی لئے ہمارا دین، ہماری دنیا اسی عقل و نفس کے گرداب سے نہیں نکل رہا۔

انسان کو دوسرے حیوانوں سے اعلیٰ و افضل بنایا اور دماغ، قلب، روح کی صلاحیتیں بخش کر ایک امتیازی شرف عطاء کیا۔ انسان کی خودمختاری نے اپنی صادی تسلی نفسِ کلّ کی سطح تک پا کر یہ زحمت ہی گوارا نہ کی کہ لطیفۂ نفس اور قلب و روح کی دنیا تک اٹھ سکتا۔ نفسِ کلّ کی دنیا میں سوائے اپنی نفسانفسی کے کیا تھا۔ مذہب تک کے نام پر عاملانِ دین اپنے ہی اقتدار کو مستحکم کرتے رہے۔ اسی لئے علیٰحدہ علیٰحدہ مذاہب کو اپنی میراث بنا کر بیٹھے رہے۔ دین کی یہ حالت یہودیت ہی کا عطا کردہ تحفہ ہے۔ آج بھی بیشتر مذاہبِ عالم اسی انفرادیت کو اپنی ظاہری حیات کا ذریعہ بنائے ہیں۔ باطن عالم انسانی مگر ایک ہی فطرت پر ہے تلاشِ حق کا ارتقائی راستہ ایک ہی ہے۔ اسی باطنی ارتقاء میں اسلام، الاسلام کو آئندہ زمانہ میں اپنا مقام حاصل کرنا ہے۔

الاسلام کو اور مذاہب پر برتری اس لئے حاصل ہے کہ اس کی ابتداء عالمِ امر یعنی روحِ اعظم سے ہوتی ہے۔ یہاں تک رسائی کے لئے نفسِ کلّ سے نکل جانا ہے۔ علامہؒ اقبال نے اسی لئے کہا تھا کہ عقل سے آگے نکل جا کہ یہ نور، چراغِ راہ ضرور ہے مگر منزل نہیں ہے۔

عقل سے یہاں مراد، نفسِ کُل ہے جو صیہونیت، یہودیت اور برہمنیت کے وجود کا چولا بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں انحطاط بھی وقتاً فوقتاً اسی لئے آتا رہا کہ انہوں نے دینِ حنیف، خالص توحید، یعنی روح میں قیام کو مقصدِ حیات بنانے کی بجائے، بار بار اسی نیچے کی منزلِ ارتقاء یعنی نفسِ کُل میں الجھنا اختیار کیا اور نفسِ کُل میں قیام کو ہی مطمعِ نظر بنا لیا۔ حالانکہ تمام ادیانِ ربّانی نے نشانی کے طور پر قربانی کی تاکید و نظیر قائم کر کے ارتقائے باطن کی طرف رہنمائی کی ہے۔ مولانا رومؒ ارتقائے باطن کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

یَا کَرَامِیْ اِذْ کُرْ ھٰذَا الْبَقَر
تَاتُوْانِیْ حَشْرُ اَرْوَاحُ النَّظَر

اے مہربان اس گائے کو قربان کرو تا کہ نظر کی روحیں اکٹھی ہوں۔ نفسِ کُل کو قربان کر کے روح اور آگے کے مقامات کی طرف اپنا مطمعِ نظر رکھنے کی جانب یہ اشارہ تھا۔ اسوۂ ابراہیمی میں دنبہ کی قربانی اپنے نفس کی قربانی ہے۔ دینِ موسوی میں البقرۃ، لال گائے، نفسِ کُل کو بھی قربِ حق کی خاطر قربان کرنا بتایا گیا۔ مگر ظواہر میں گرفتار انسانیت صرف ظاہری پہلو کو اصل دین سمجھتی رہی۔ حالانکہ راہِ دین سوائے طلبِ حقیقت میں آگے بڑھنے کے کیا ہو سکتی تھی اسلام نے ہی اس نقطۂ ارتقائے باطن کو صحیح معنوں میں روح کے مقام سے پکڑا اور جب اس کی یلغار، صیہونیت، یہودیت اور نفسِ کُل کے تمام حامیوں اور پیروکاروں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی تو اس یہودیت اور صیہونیت نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اور اپنی فطری ذہانت سے غلط تاویلیں اور معنی پیش کر کے اسلام کی راہ کھوٹی کی۔ اس طرح نفسِ کُل کی منزل سے اُسے بھی ایک غلط انسیت بخشی۔ مثال کے طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کو ہی لیجئے کہ ''علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے'' اس کی غلط تاویل پیش کر کے نظر صرف ظاہری یا دینی علم تک محدود کرا دی۔ چینیوں کا اپنے آباؤ اجداد کی ارواح سے قدر و منزلت کا تعلق، ان کی حقیقت بینی، ان کی حق پسندی، ان کی اعانتِ حق بھی تو ایک مخزنِ علم تھی۔ یہ ہی کیا اسی قسم کی مسلسل اور لاکھوں معانی فہمیاں اس رنگ میں پیش کیں کہ الاسلام مادّیت کی سطح سے نہ اٹھنے پائے۔

مادّیت کی سطح تو ہے ہی تمام کی تمام نفسِ کل خواہ اسے مذہب کا رنگ دیا جائے یا کچھ اور۔ مذہبِ موسوی میں یہ نفسِ کُل کچھ اس طرح چھایا ہے کہ حق کی طرف متوجہ ہونے تک میں، اعمال و اخلاق کی بلندی پیش کرنے میں، طالبانِ حق نے اپنے ذاتی نفع نقصان کا خیال نہیں چھوڑا۔ ان کی نیکی، اخلاق، خیرات، عبادت، ریاضت سب کی سب اپنی ذاتی فلاحِ دارین کے لئے وہ سطح اختیار کئے رہے کہ نفسِ کل سے اٹھ کر طلبِ حقیقت کی جانب گامزن نہ ہو سکے نتیجتاً دینِ موسوی میں نفع نقصان سے ماوراء کوئی تخیل ہی نہیں آتا۔ انسانیت کی وہ تمام اعلیٰ اقدار، محبّت، خدمت، ایثار، قربانی، شہادت وغیرہ نہ مذہب کا جزوِ لاینفک بن سکیں نہ روزمرہ کی زندگی میں ان کی گنجائش رہی اس طرح تمام دین دنیا کی زندگی صرف انفرادی نفع نقصان کا رخ لے کر رہ گئی۔ ظاہر شریعت میں ان اعلیٰ اقدار کو نظر انداز کر دینے سے نہ فرق پڑتا تھا۔ نہ کوئی کوتاہی محسوس ہوتی تھی۔ مثلاً زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد اور مزید خیرات کی بلا امیدِ ثواب و جزاء کیا ضرورت باقی تھی۔ اسی طرح پڑوسیوں کے حقوق کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کر لینے کے بعد، عام انسانیت کی خاطر خدمت، ایثار کے چکّروں کی کیا ضرورت عام طور پر محسوس ہوتی تھی۔ شرعاً صرف احکام کی پابندی تک اپنے کو محدود کئے رکھنا جائز ضرور نظر آتا ہے مگر میثاقِ ازل سے گری ہوئی بات ہے بلکہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔

فطرت ہی میزان ہے اسلام دینِ فطرت ہے۔ اسلام ظاہر و باطن کے درمیان ایک میزان قائم رکھنے پر زور دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ ظاہر کچھ باطن کچھ۔ اپنی روزمرّہ زندگی میں قائم کردہ حدود سے نکل جانے کو اسلام، مصلحت نہیں گردانتا۔ ایک اعتدال، ایک توازن پر زندگی گزارنے کا سبق دیتا ہے۔ یہاں تک کہ عبادت تک میں بس وہی سختی جو برداشت کی جا سکے۔ بیمار کو روزہ میں رعایت، مسافر کو نماز میں رعایت اور اسی طرح مسلمان کیلئے نہ سُستی نہ جلد بازی۔ نہ کنجوسی نہ فضول خرچی نہ بھوکا مرنا نہ شکم پوری۔ نہ مزاج کی کمزوری نہ ظلم گویا اس طرح تمام افراط تفریط کو فطرت کیخلاف گردانتا ہے۔ اسلام کا یہ توازن تمام عالم انسانی کو اپنی آغوش میں لئے ہے۔ باعثِ رحمت ہے۔ فطرتِ کُن اور ارتقائے انسانیت کے قدرتی پہلو کی میزان قائم رکھے ہے۔ اسی لئے تمام مذہبی کتابوں کی تائید کرتا ہے۔ تمام نبیوں کے پیغامات کی

تصدیق کرتا ہے سارے انبیاء کی عزت وحرمت قائم کراتے ہوئے، انکی کوششوں کو اپنے میں ایسے سمیٹ لیتا ہے کہ یہی سب کا ماحصل اور آخری پیغام بن کر پیش ہوتا ہے۔

اللہ تعالی نے دینِ اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسی لئے جب بھی شیطنت یہودیت، یعنی نفسِ کلُ نے اسلام کے اندر قیام و جمود کی کوشش کی اس کا قلع قمع کر دیا گیا خلفائے بنوعباس کے دَور میں مسلمانوں نے جب یہودیت یعنی نفسِ کلُ کی قربانی کی بجائے اسکی پیروی شروع کر دی تو تاتاری وحشی، ہلاکو کی قیادت میں تازیانہ الٰہی بن کر بغداد کو تخت و تاراج کر گئے۔ حالانکہ حضرت فریدالدین عطارؒ جیسی برگزیدہ ہستی اِن نفسِ کلُ کے والہ وشہدا مسلمانوں اور عالمانِ ظاہر کو بچانے کیلئے کوشاں تھی۔ چونکہ حضرت عطارؒ انفرادی حیثیت سے اسی قہرِ کلُ میں دخل انداز ہوئے اس لئے کامیابی نہیں ہوئی۔ حالانکہ انکا وجود، اللہ جل شانہٗ کے دستِ قدرت سے کوئی غیریت نہیں رکھتا تھا۔ یہ کام کسی ایک فرد کے بس کا روگ نہ تھا۔ قلبِ کلُ سے گزر کر روحِ اعظم کی سطح سے اسکا تدارک ممکن تھا۔ اس کیلئے تمام فقراء میں توحیدِ فکر کی ضرورت تھی آج بھی اسلام کی ابتلاء یہی نفسِ کلُ ہے۔ اس کیلئے تمام فقراء میں توحیدِ فکر کی ضرورت ہے یہودیت کے نفسِ کلُ پر فتح پانے کا بس یہی ذریعہ ہے۔ نفسِ کلُ کی نفی کی کوشش سعیِ لاحاصل ہے۔ یہ نفسِ کلُ یا نفس کو فنا کرنے کی بات نہیں۔ نفسِ کلُ کبھی تباہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی تباہی کے معنی خود وجود اور تعیّنات کی نفی ہے جو اس جہان کے قائم رہتے ہوئے ممکن نہیں۔ یہیں سے اس حدیثِ مکرّم کے معنی بھی واضح ہوتے ہیں کہ ''یہودیوں کو کوئی مکان نہیں ملے گا'' ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اسرائیل کا وجود اس حدیثِ مقدس کا منافی ہے۔ ہرگز نہیں۔ مکان، کے معنی یہاں قیام کے ہیں۔ قیام جسم کو نہیں ہوتا بلکہ رُوح کو ہوتا ہے اور انشاءاللہ یہودیت کو کبھی قیام اس انداز کا نہ آئے گا، کیوں کہ دینِ موسوی کی حدِّ رسائی بس لطیفۂ نفس تک ہے۔

الغرض اُمتِ محمدی کے بیڑے کی سلامتی و نجات الاسلام ہی میں مضمر ہے۔ آئینِ دینِ متین امرِ ربّی ہے۔ یہ روح کی منازل ہیں۔ یہاں رحمتوں کے سائے ہیں۔ ان ہی

رحمتوں کے سائے میں حیاتِ دین ہے۔ اسم گرامی نبی کریمؐ وہ سادہ سا نسخہ ہے جس کی حمیّت اور غیرت ہر کلمہ گو کے رگ و پے میں سمائی ہے۔ اسکی حرمت وعزت کی خاطر وہ از خود رفتہ ہو کر سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ درودِ تاج اس ذاتِ مبارک سے شعوری اور لاشعوری رابطہ قائم کرانے کا ذریعہ ہے۔ مسلمان کو من حیث القوُم اسی درودِ تاج کو اپنی مشعلِ ہدایت و استعانت بنانا ہے کہ جتنی جسکے نصیب میں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر سطح کے افراد کیلئے اسکی لطافتیں اور انوار جُدا ہیں۔ مگر رحمت عام ہے بلاتشخیص ہے فقراء کو توحیدِ فکر اسی کے طفیل نصیب ہے۔ ایک والہانہ، عاشقانہ نسبت اور رابطہ ایک قلندر ہی جانتا ہے۔ ہر شے کی حقیقت کا اپنانا، ہر شے کی حقیقت کو سمونا، ہر شے کی حقیقت ہو جانا قلندر ہی کا حِصّہ ہے۔ وہی صحیح معنوں میں درودِ تاج کی تجرید کو پاتا ہے۔ یہی جذبۂ قلندرانہ کچھ نہ کچھ حد تک اس قوم کے رگ و پے میں صدیوں سے سمایا ہے۔ ایمان کی یہ رحمتِ کُن اسلام کے پیرویان کیلئے عام ہے۔ عقل کی دنیا سے نکل کر دل کی دنیا میں اس حقیقت کو پا جانا ہے۔ قوم کیلئے فی زمانہ یہی ایک نصب العین اور رابطے کی بات ہے۔

اس سے قبل بسمِ اللہ کی تجرید کو پانا ہے تا کہ منزل شروع ہو، بسم اللہ کے انوار ایک طرف دوسری طرف تمہارا تجرّد یہ گویا دو ہتھیلیاں ہیں جو ساتھ بجائی جائیں تو انکی آواز ''فیکون'' ہے۔ اسی آواز کی تجرید کو صوتِ سرمدی، کہتے ہیں۔ اور سُن بھی لیا تو کیا ہوا دیکھ بھی لیا تو کیا کیا۔ جب تک عشق محبوبؐ میں شمع کی دونوں لوئیں ایک نہ ہو جائیں یہ حُسنِ تجرید کیسے نِکھرے۔ جب تک هَلْ جزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان کے معنی آشکار نہ ہو جائیں الاسلام میں پورے پورے نہیں اترتے۔ اور دین میں پورا پورا اترنا ہی مقصدِ حیات ہے۔

فقیر محمد عبیداللہ درّانی
قادرنگر۔ پیر بابا (بُنیر)
سوات۔ مغربی پاکستان

باب ۱

اسلام دینِ فطرت

اللہ نے ہر بچّہ کو اسلام پر پیدا کیا۔ توحیدی صفات سے نوازا۔ اسکی تمام صلاحیتوں کو یک رخی دیدی گئی۔ جس کی بناء پر اسکی زندگی مکمل توحیدِ ذاتی میں ہوگئی۔ اس طرح عالمِ انسانیت کی بنیادِ وجود ایک ہی جیسی قائم کر دی گئی۔ اسلام دینِ فطرت کہلایا۔ عین فطرتِ انسانی کے مطابق۔ اسی لئے جب بھی انسان اس فطری معصومیت، اس ظاہر باطن کی یکتائیتِ جمعیّت میں رہتا ہے تو اس کا ہر تخیل، ہر ارادہ، ہر عمل، یہی فطری سادگی لئے ہوتا ہے اور اسی میں سلامتی اور امن ہے۔ بے دین، مومن، مشرک، کافر، تو بعد میں اسکے ماں باپ یا معاشرہ بنا لیتا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات ہیں

''اللہ نے تمہارے لئے دین اسلام ہی پسند کیا''

''اے ایمان لانے والو، اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ''۔ یہ خطاب عالمِ انسانیت سے ہے اور کچھ اسطرح کہ زندگیٔ انسانی کیلئے بنیادِ دین، یکسوئی ہوئی، تمام صلاحیتوں کی یک رخی اور جامعیّت ہوئی، وجود انسانی میں تمام صفات کی توحید ہوئی یعنی اسلام ہوئی۔ اپنے اندر تمام صفات کی یہ میزان قائم ہو جانے کے بعد ہی سکون حاصل ہوتا ہے۔ جو فروغِ عمل کی بنیاد ہے۔ اس طرح انتشارِ شخصیت کی جگہ اعتمادِ شخصیت حاصل ہوتی ہے۔ حق کا عالمِ انسانیت کو بار بار اسلام کی طرف رجوع کرنا اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اپنی بنیادِ وجود کی طرف رجوع ہو سکے۔ ذہن وفکر کی یہ یک رخی اپنی تمام صفات کی توحید ہیں، یہ تلاشِ حق اور تجسّس حقیقت خلیل اللہ کا جذبہ ہے، توحیدی رنگ ہے، ہر نظارے، ہر شے، ہر ارادے، ہر عمل کے پیچھے اپنے رب کی کارفرمائی دیکھنا ہی براہیمی خصوصیت ہے۔ خود اپنی صلاحیتوں کی یک رخی اور فطرت سے ہم آہنگی میں توحید کو پانا ہے۔ اسلام کی یہ پہلی منزل بنیادِ دین ہے۔

پھر کہیں ان منازل میں قدم رکھ سکتے ہیں جن میں شریعت آتی ہے۔ پھر طریقت اور بعدازاں حقیقت۔

شریعت کیا ہے؟ مختصر الفاظ میں اسے اصول زندگی، اصولِ بندگی کہہ لیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ اپنے نفس کی پہچان قائم کرکے، حق کی پہچان کر لینا اس کا دائرہ عمل ہے۔ ایک چھپی ہوئی چیز، ایک کھوئی ہوئی شے کی تلاش اور تجسّس تو ابراہیمی جذبہ تھا اب کلیمی کہ میں تجھے دیکھوں گا۔ میں تجھ سے بات کروں گا۔ یہی موسوی دین کی بنیاد ہونی چاہیے تھی شدّت آئی۔ اس کے ایک قدم آگے طریقت کی نگہ شرعی اصولوں کی استواری کی طرف ہوتی ہے جس کا منبع قلب ہے۔ محبت ہے، تڑپ ہے۔ اب تلاشِ حق میں بادۂ پیمائی کرنا، یا شرع وقوانین کی پابندی کے مطابق محبوب کے سامنے پیشی مقصود نہیں ہوتی بلکہ اپنے ربّ سے لگاؤ قائم ہو جانے کے بعد، محبت کا رشتہ استوار ہو جانے کے بعد، ایک شدّتِ عشق ہے، ایک والہانہ پن ہے۔ یہ وہ کیفیّت ہے کہ اپنے نفس سے قطع تعلق ہو کر اپنی ''میں'' سے نجات حاصل کرکے تُو ہی تُو کا انداز سجایا۔ ''یہ روحی من روح اللہ'' کا مقام ہے۔ یہ عیسوی اسلام ہے۔ اب عشق کی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنا سب کچھ بھولا محبوبِ حقیقی کا ایسا تخیل چھایا کہ ہر دم تُو ہی تُو۔ اللہ ہُو۔ ایک اور قدم جو حقیقت کے میدان میں آئے تو اسلام میں داخل ہوئے، اب اپنے ہی انوار نکھر آئے۔ اور کچھ ایسے کہ منصور ''انا الحق'' پکار اٹھا اور مجنوں ''انا لیلیٰ''۔ یعنی عاشق خود معشوق ہونے کا دعویدار بنا۔ جب محویت و استغراق میں اور شدّت ہوئی تو خود اپنی منتہا بنا، آپ اپنی معراج۔ یہ عروجِ خودی گویا حقیقت کا اپنے اندر طلوع ہونا ہے اور یہ وہ نازک پل صراط ہے کہ اَنَا الْحَق کہنے والا اس مقام پر قابل گردن زدنی ہوا۔ کیونکہ یہ عبداللہ کا مقام ہے۔ یہ اس کا مقام ہے۔ جس نے عروج کی انتہائی منازل پر پہنچ کر بھی عبدیت و عاجزی کا دامن نہ چھوڑا یہ ''نُوْرٌ مِّنْ نُّورِ اللّٰہ'' کا مقام ہے یہ مقامِ محمدی ہے۔ جس نے اس کو دیکھا اس نے حق کو دیکھا کہ یہی مظہرِ حق ہے یہی ''لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاک'' کا مصداق اسی کیلئے مقامِ محمود ہے، اسی کو حق نے محبوب کہہ کر نوازا، اللہ اور فرشتوں نے درود و سلام بھیجا۔ اسی کا ذکر آسمانوں میں بلند کر دیا گیا۔ ملائکہ اور حق کی تمام حقیقتیں اسی مظہرِ حق سے نشر ہونے لگیں۔

عیسوی اسلام کی سطح تک دوڑی تھی، تڑپ تھی۔ وصل کی طلب تھی۔ کیونکہ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے، عاشق کہاں پہنچ سکتا ہے۔ مقامِ محبوبیت پر۔ یہی مقامِ عبدیت ہے یہی مقام محمود ہے۔ یہاں اناالحق کی انا بھی ختم ہو چکی ہوتی۔ اب حق ہی حق رہ جاتا ہے۔ ''اَلْفَقْرُ هُوَاللّٰه'' جو اس نے کہا وہی گویا حق نے کہا اور جو کہا وہی ہوا۔ یہ ہے دینِ محمدؐی، یہ ہے جانِ اسلام، یہ ہے اسلام، قولِ فیصل۔ جو پائے حق کیلئے دین کی چار خصوصی حقیقتیں اس طرح پر تھیں۔ ادھر اسلام کے نام لیواؤں کا یہ حال ہے کہ ہنوز روزِ اوّل نہ ان کی توجہ تلاشِ حق کی طرف ہے نہ انہیں تجسّس حقیقت کی فکر ہے نہ ہی انکی تمام صلاحیتوں میں جمعیّت توحید قائم ہے۔ انہوں نے صرف زبان سے ایک خدا کہہ دینے کو توحید قرار دے لیا ہے، گویا ان سے جذبِ براہیمی قائم نہ ہو سکا، وفائے ابراہیمی، خلعتِ براہیمی کو نہ اپنا سکے تعیّنات کے بت مسمار کر کے مجرّد اتِ حق کی طرف رجوع نہ ہو سکے، نہ ہی ذات کی طرف رجوع ہو سکے، نہ ہی اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَالسَّمٰوٰاتِ وِالْاَرْض کی حقیقت اپنا کر نماز کی نیت براہیمی انداز میں باندھ سکے۔ یہ تو اسلام کا پہلا قدم تھا۔ اشیاء کے ظواہر سے نظر ہٹا کر ان کی حقیقت، ان کے باطن کی طرف نگاہ رکھنا تھی۔ صفات سے نکل کر، ظواہر کے بت توڑ کر، تعیّنات کے پردوں کو چاک کر کے حقیقت کی تلاش کی راہ اختیار کرنا تھی اور اپنی تمام صلاحیتوں کی یک سوئی، یک رخی، یعنی توحید کا خلیلی رنگ نکھرنا تھا۔ وہ نارِ نمرود سے نکلنے کیلئے بھی جبرائیل کا سہارا تک نہ لینا۔ نارِ عشق کا گلزار ہو جانا، ہجر و تلاش کی آگ سے نکل کر اپنی حقیقت کے گلزار تک رسائی حیاۃ بعدالممات پر مشاہدہ کے بعد تیقن۔ خوابیدہ یا مردہ روحوں میں پھر سے بالیدگی اور ارتقاء کی بابت اطمینانِ قلب۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر صحرا نوردی۔ دنیاوی رشتوں سے قطع تعلق کر کے محبوبِ ازلی کی تلاش، حَیُّ و قَیُّوْم کی قدرتوں سے شناسائی۔ ذبح اسمٰعیل (لَااِلٰه کی چھری سے اپنی ''میں'' کی قربانی) اسمٰعیلؑ کی جگہ دنبہ کا فدیہ (قوم کی روحانی منزل اور اسکے ارتقاء باطنی کی نشانی) بی بی ہاجرہؑ کا پانی کی تلاش میں صفا مروہ کے درمیان دوڑنا (تعیّنات کی حدود میں فیضانِ حق کی تلاش) ننھے اسمٰعیلؑ کے پاؤں مارنے کی جگہ سے چشمے کا جاری ہونا۔ (نبی اسمٰعیل کا مرجعِ خلائق ہونا اور فیض کے اجراء کی طرف اشارہ) کعبہ کی بنیاد، اللہ کے پہلے گھر

کا قیام اسی کائنات عالم میں، کعبہ تیقنِ ذات کی نشانی، بے رنگ و بے چون ذات پردۂ غیب میں ذات، شش جہت میں ذات، مکعب شش جہت کا اظہار۔ کعبہ حرمِ دل کی نشانی مجملِ ذات، حدودِ کعبہ (پابندی شرع) یہ اور اسی قسم کی نشانیاں پانا اس لئے ضروری ہے کہ ان ہی کے مطابق اپنے فکر و عمل کو ڈھالنا ہے اور ان ہی میں سے راہِ حق ڈھونڈنا ہے۔ انبیاء کی زندگی، طریقۂ فکر، ارشاد اور نشرِ حق کیلئے جدوجہد کا طریق پہچاننا ہے۔ کہ ان کی سنّتِ باطنی کی بھی پیروی ہو سکے۔ غور کریں تو انبیاء کی ساری زندگیاں اسی کاوش میں صرف ہوئیں کہ انسانیت کو حق کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کیلئے شریعت کے قوانین کی پابندی میں آدابِ بندگی بتائے گئے۔ احترامِ انسانیت سکھایا گیا ایک سطح اور اوپر جب نفس کو تہذیب دی جا چکی تو قلب میں حق کا یقین پیدا کرا کے حق کو دلوں میں اتارا گیا۔ کبھی علمی بحث و تکرار سے زبانوں کو خاموش کر دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کبھی ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے جن میں فلسفی الجھنیں پیدا ہوتیں اور نہ لفظی بحثیں کیں۔ نہ دلائل دیئے، کیونکہ ان کا مقصد ذہن میں خلش پیدا کرنا نہ تھا۔ بلکہ دلوں میں اس حقیقت کا جگانا تھا جو اپنے باطن میں ودیعت ہوئی ہیں۔ اسی لئے تمام انبیاء نے جو طریقِ تعلیم اختیار کیا وہ قلوب میں یقین و ثبات پیدا کرتا رہا اور اس سے مضطربؔ روحوں کو سکون اور پریشان زندگیوں کو قرار ملتا رہا۔ ان کی تعلیم کا مقصد ذہن کو سراغ یا تلاش میں ڈالنا ہرگز نہ تھا۔ بلکہ براہِ راست سادگی سے صراطِ مستقیم کی نشان دہی کر کے منزل تک پہنچا دینا تھا۔ انبیاء علیہم السلام میں پیغمبرانہ استقامت اور توکّل کی مثالیں اسی لئے دیکھنے میں آئیں کہ انہیں اللہ کی ذات اور اللہ کے احکم الحاکمین ہونے پر پورا یقین دلا دیا گیا تھا۔ تھے وہ بھی انسان۔ اور وہ بھی اکثر بے سروسامان اور تنہا اور علوم ظواہر سے کنارہ کش۔ مگر دنیا نے بار بار دیکھا کہ بڑے بڑے جابروں، طاقت وروں، اور عالموں نے انہیں چیلنج دئے مگر ان کے دلوں میں ذرّہ بھر بھی گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی۔ انہیں یہ بھروسہ کسی نہ کسی طرح ضرور حاصل ہو چکا تھا کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور دشمن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہی وہ اعتماد وہ اپنی قوموں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خدا پر یہ کھلا بھروسہ ان کے ایمان کی دلیل تھی۔ بات یہ بھی تھی کہ منکرین، باطل پرست ہو کر سچّے خدا سے نہیں ڈرتے، تو پیغمبر خدا پرست ہو کر باطل سے

کیونکر ڈر سکتے تھے۔ منکر اپنی گمراہی کی وجہ سے شک و گمان میں ہوتے تھے اور پیغمبر، یقین و عرفان کی منزل میں۔ اس لئے جب منکر قائل ہونے لگتے تو آخر میں کہنے لگتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے ہمارے بزرگ ایسا کرتے آئے ہیں۔ پیغمبر انہیں کہتے کہ انہیں خدا کی طرف سے علم بصیرت حاصل ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ خدا پرستی کی راہ میں آباو اجداد کی پیروی اور رسم و تقلید مناسب نہیں اسی لئے پرستش اسی کی کرنی چاہیے۔ جس کی پرستش پر علمِ بصیرت اور وجدان گواہی دے، یعنی قلب و روح اس کی تصدیق کریں۔

اب عالمِ انسانی کو خود اپنا جائزہ لینا ہے کہ جن کے دل بجھے ہوں اور وہ صرف مادہ پرستی اور خواہش نفسانی میں لگے ہوں تو وہ تو مُردہ ہیں۔ ان کے قلوب و روح مُردہ ہیں۔ زندوں کا خدا تو وہی خدا ہوسکتا ہے۔ جو حاضر ناظر ہو۔ **سَمِیْعٌ بَصِیْر** ہو۔ **عَلِیْمٌ خَبِیْر** ہو۔ **عَزِیْزٌ حَکِیْم** ہو۔ **حَیُّ قَیُّوْم** ہو۔ ایسا ہی ربّ محبت، تعریف، پرستش کے لائق ہے ایسا ہی خدا کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہوسکتا ہے وہی ہر جاندار کو پالنے والا وہی انسان کو فلاح دارین کی راہ دکھانے والا، یعنی مادّی اور روحانی فوائد و منافع کی طرف رہنمائی کرنے والا۔ بھوک میں رزق اور بیماری میں شفا بخشنے والا۔ اسی کی ذات ہے جو مارتی ہے۔ جلاتی ہے۔ اور اعمال کا حساب لیکر جزاء و سزا دیتی ہے اب دنیاوی جاہ و جلال والوں، یا اپنی خواہشات کے بتوں یا اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں، یا اپنی عقل و دانش میں یہ طاقت کہاں کہ وہ یہ دعوٰی کرسکیں کہ وہی پالنے والے ہیں۔ وہی مارنے اور جلانے والے ہیں۔ وہی راہ ہدایت دکھانے والے ہیں۔ اور وہی نفع پہنچانے والے ہیں دین اور دنیا کے۔

غور سے دیکھیں تو عالمِ انسانیت کی گمراہی کا سبب بیشتر یہی رہا ہے کہ ان کے اوپر ظالم، طاقتور اور حاکم انسانوں کا رعب حاوی ہوتا ہے۔ یا مال و دولت اور روزی حاصل کرنے کیلئے مادّی ذرائع کا خیال طاری رہتا ہے، یا وہم و باطل پرستی ان کی عقلوں پر سوار ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر زمانہ میں جب بھی پیغمبر آئے تو وہ بار بار یہ یاد دلاتے رہے کہ اللہ کے سوا کوئی روزی دینے والا نہیں اور خدا جب چاہے اپنی مشیّت کے مطابق عطا کرتا ہے۔ روزی کی تلاش میں غلط راستوں پر بھٹکنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے سے اس میں ذرّہ بھر اضافہ ممکن نہیں۔ اس

لئے اُس کے شکر گزار بندے بنو۔ اس کا شکر ادا کرتے رہو تو وہ اور رحمت کے دروازے کھولتا ہے۔ اس شکر گزاری میں اس کی پرستش کرو کہ بالآخر تمہیں اس کے پاس جانا ہے۔ موت سے بے نیاز کرنے اور حیات بعد الممات کا یقین دلانے کے لئے انبیاء تاکید کرتے رہے کہ اگر دوبارہ جی اٹھنے میں شک ہو تو خود اپنی ذات میں غور کرو کہ پہلے تم کچھ نہ تھے اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے گا۔ اس کیلئے یہ بالکل آسان ہے یا پھر دیکھو کہ تمہارے جسم کے خلیئے ہر چالیس دن بعد بالکل نئے ہو جاتے ہیں۔ پرانے خلیوں کے خاتمے کے بعد نئے خلیئے ظہور میں آتے ہیں۔ اسی طرح محدود زندگی و موت کا یہ سلسلہ بچپن سے بڑھاپے تک ہوتا ہے بار بار قوّتِ حیات آنے پر غور کرو جسم کی نشوونما پر غور کرو۔ ماں کے پیٹ اور بچپن سے بڑھاپے تک جسم کی ارتقائی منازل دیکھو۔ ان گہرائیوں پر بھی فکر و انہماک کرو کہ جسے جسے توفیق ربّی بامر ربّی عطاء ہوئی۔ اس کی روحانی منازل کس طرح طے ہوتی رہتی ہیں ایک موت کے بعد دوسری روحانی منازل اور ارتقاء کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس طرح حیّ و قیوم کا ظہور دن رات وجود انسانی میں ہوتا رہتا ہے۔ کُن فیکون جاری و ساری ہے۔ رحمت عام ہے۔ رحمت کے دروازے سب کیلئے کھُلے ہیں۔ اور عالمِ انسانی کی فلاح کیلئے حق خود ہی بتیاب نظر آتا ہے۔ شانِ رحمت کا یہی تقاضا ہے۔ اس لئے انبیاء بھی سراپا رحمت بن کر عالمِ انسانیت میں زندگی گزارتے رہے۔ تعلیم و نصیحت کے لئے نرمی کا انداز اختیار کرتے رہے۔ حضرت ابراہیمؑ آزر کے غصّہ کا جواب کس نرمی سے دیتے ہیں۔ ''آپ پر سلامتی ہو۔ میں آپ کے لئے اپنے پروردگار سے بخشش طلب کروں گا'' حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے بارے میں بتا دیا گیا اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے''۔ حضرت عیسیٰؑ سراپا محبت بن کر حق کا پیغام محبت بھرے الفاظ میں دیتے رہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خلقِ عظیم کا لقب ملا۔ رحمت اللعالمینؐ بنا کر دنیا میں بھیجے گئے۔ آپ کے زمانے میں لوگوں کو علم پر غرور تھا۔ زبان دانی پر ناز تھا۔ اس لئے قرآن کریم کا ارشاد ہوا۔

''لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی
طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو''

اس طرح پیغمبر کا کام صلح و آشتی کے انداز میں تبلیغ کرنا تھا۔ ہدایت اور خبر پہنچانا تھا۔ حکم چلانا نہ تھا وضاحت سے پیغام پہنچانا تھا، جبر و تشدد کرنا نہ تھا۔ ترغیب دینا تھا۔ زبردستی مجبور کرنا نہ تھا۔ اصلاح کی کوشش کرنا تھا، اپنی بات کو جبراً منوانا نہ تھا۔ اسی طریقہ کار کو اپنا کر بیشتر انبیاء عالم انسانی کی اپنی بھلائی کی خاطر، اس کی اصلاح میں لگے رہے۔ اور روحانی طبیب بن کر ان کے علاج اور صحت روحانی کے لئے کوشاں رہے۔ مگر اس کے جواب میں قوم ان سے معجزے طلب کرتی رہی۔ پیغمبر کہتے رہے میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں کہ تمہیں اس کی طرف بلاؤں۔ ان کی قوم کہتی رہی کہ ہمارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگوا دیجئے۔ پیغمبر کہتے رہے کہ تمہیں تاریکیوں سے روشنیوں میں لے جانے کیلئے بھیجا گیا ہوں۔ قوم کہتی رہی پہلے گھر تو سونے کا بنا دو۔ آسمان کا ایک ٹکڑا ہم پر لا گراؤ۔ پیغمبر کہتے رہے کہ میں تمہارے دلوں کا زنگ دھونے اور انہیں منور کرنے کیلئے بھیجا گیا ہوں۔ قوم کہتی رہی ذرا سیڑھی لگا کر آسمان پر تو چڑھ جاؤ اور ایک لکھی لکھائی کتاب وہاں سے لے آؤ۔ خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دو۔

القصّہ عالمِ انسانیت اسی طرح ہٹ دھرمی اور جہالت پر قائم رہی۔ مادّیت سے بلند ہو کر خدا کو ان سب چیزوں کا مالک، ہر ارادہ کا منبع ماننے سے انکار کرتی رہی۔ قانون فطرت اور اپنی عقل کے مطابق ہی سبب اور نتیجہ کی حدود میں حیاتِ عالم کو دیکھتی رہی۔ اسکی نظر اس طرف نہ گئی کہ مسبّب الاسباب بھی کوئی ذات ہے۔ ان قوانین کو مقرر کرنے والی بھی کوئی ذات ہے جو ان قوانین سے یقیناً بالا و برتر ہے اور کوئی بھی ارادہ کر لینے کی مجاز ہے۔ اسکو ثابت کرنے کیلئے پیغمبروں کو معجزات بھی عطاء ہوئے تا کہ ان کی عقل کم از کم عاجز ہو کر ہی خدا کو قوی و بالاتر سمجھے اور عالمِ امکان کی ہر شے، ہر قانون، ہر مظہر کو اسکے حکم کی پابند سمجھے کہ وہ ذات جامع الصّفات، کسی کام کا ارادہ کرے اور کہے کہ ایسا ہو تو اس کے حکم کے مطابق وہی ہو جائے۔ وہی کچھ ظہور میں آئے۔

پیغمبروں کو یہ معجزات اسی مناسبت سے عطا ہوئے کہ جس قوم کی جو امتیازی خصوصیت تھی اس سے خدا کی قدرت کہیں بالا و برتر ثابت کر دی جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کے

زمانہ میں علم نجوم کا زور تھا اور علم کیمیا ترقی پر تھا۔ آگ کو سورج کا مظہر بنا کر اور سورج کو خدا مان کر پوجتے تھے۔ اسی لئے آپ کیلئے آگ کی خصوصیت بدل دی گئی تا کہ یہ لوگ جان لیں کہ آگ خود کسی کے حکم کی پابند ہے اور کن کہنا یا حکم چلانا ان جھوٹے خداؤں کے بس کی بات نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں علم سحر عروج پر تھا۔ اس لئے آپکو عصا اور یدِ بیضا کے معجزات عطاء ہوئے کہ ان کے آگے باکمال ساحر بھی پکار اُٹھے ''ہم ایمان لائے پروردگارِ عالم پر موسیٰؑ اور ہارونؑ کے پروردگار پر۔'' حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ علم و طب اور طبعیات کے معراج کمال پر تھا چنانچہ آپکو مسیحائی کا معجزہ ملا کہ نابینا کو بینا کر دیا جذامیوں کو درست کر دیا۔ مردوں کو زندہ کر دیا اور گہوارہ میں سے ہی فرما دیا ''میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اور نبیؑ بنایا ہے۔'' حضور نبی کریمؐ کے زمانے میں عربؔ کے عالموں کو زبان دانی پر ناز تھا اور اس حد تک کہ باقی دنیا کے لوگوں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے، قرآن کریم نے چیلنج دیا۔ ''ایک سورۃ اس جیسی لے آؤ'' مخالفین کو ماننا پڑا کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ قرآن نے تائید کی کہ

''یہ تو اللہ کا کلام ہے۔ کیا تم کو اس بات سے تعجب ہوا ہے کہ تم میں
ایک شخص کے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے
نصیحت آئی تا کہ وہ تمہیں ڈرائے''

حضورؐ نے فرمایا ''میں یہ نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں۔ نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اس حکم پر چلتا ہوں جو بذریعہ وحی میرے پاس آیا ہے۔''

پیغام کی اس صداقت اور سادگی کی بناء پر جب قوموں نے ہدایت پکڑی تو اس ہدایت کے بعد گمراہی اور خود پرستی نے اکثر ایک نیا روپ اختیار کیا وہ یہ کہ ہر قوم جسے انبیاء کا قربؔ عطا ہوا یا جسے علم کتاب حاصل ہوا۔ اس نے اپنی فضیلت اور سمجھا کہ ہدایت الٰہی ان ہی کیلئے مخصوص ہے۔ بنی اسرائیل ہمیشہ اسی خیال میں مبتلا رہے۔ کہ انکی نسل تمام دیگر نسل انسانی سے ممتاز ہے اور خدا کی ہدایت اور انعامات کے صرف وہی مستحق ہیں۔ یہی حال عیسائیوں کا ہوا کہ وہ یہ سمجھتے رہے کہ عیسیٰؑ کو صرف ان ہی کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا تھا اور دنیا میں ان سے زیادہ مہذب اور صحیح ہدایت پر کوئی دوسری قوم نہیں یہی حال زرتشتیوں، ہندوؤں، بدھوؤں اور دوسرے

مذاہب کا رہا۔ یہ سعادت اسلام ہی کو نصیب ہے کہ اس نے تمام بنی نوعِ انسانی کو مساوات کا سبق دیا۔ حضور اکرمؐ کے طفیل مسلمانوں کو یہی سبق ملا کہ یہ پیغام صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ تمام عالمِ انسانی کیلئے ہے روشنی، دھوپ، ہوا، پانی سب کیلئے ہیں۔ سب کا پالنے والا ربّ العالمین ہے۔ وہی سب کی ہدایت کیلئے سامان کرتا ہے۔ اس لئے فرد کا فروغ صرف فروغِ جمعیّت میں ہے، یہی انداز نبی کریم کے طفیل بزرگانِ دین و ہادیانِ کرام کا رہا ہے کہ انسان کو نفسانفسی، خود پرستی اور خودستائی سے نکال کر خدمتِ خلق، غمِ جمعیّت، فروغِ جمعیّت کی فکر میں لگا دیا۔ انسان کی بڑائی اور بزرگی کا معیار عقل، علم، عبادت، خاندان، نسل وغیرہ مقرر نہیں کیا بلکہ یہ سب بت توڑ کر تقویٰ کو بزرگی کی کسوٹی بتایا، تاکہ عالم انسانیت میں عاجز اور اللہ سے ڈرنے والے بندے سب سے بلند سمجھے جائیں۔ تاکہ اپنے کو ہر منکرات وفواحش سے روکنے والے متّقی صرف اپنے عمل کے بل بوتے پر بزرگ کہلائیں۔ لہٰذا جو پرہیز گار ہوا وہی اکرم کہلانے کا مستحق قرار پایا۔

باب۲

ارتقائے اسلام

حضرت آدمؑ نے ۹۳۰ سال عمر پائی۔ ہر قسم کی مٹی سے آپ کا پتلا بنایا گیا۔ اس میں حق نے رُوح پھونکی پھر کمالِ ظاہری و باطنی سے آراستہ کر کے عزّت اور بزرگی بخشی۔ حضرت آدمؑ کو اسماء بھی سکھائے تا کہ فرشتوں کے سجدے کے قابل ہوسکیں۔ شیطان جو ناری تھا، انکاری ہوا۔ فرشتوں نے بھی سوال کیا کہ کیا ایسے کو جو دُنیا میں فساد پھیلائے ہم پر سبقت دی جائے گی؟ خدا کے یہ کہنے پر کہ جو علم مجھے ہے وہ تم نہیں جانتے فرشتے تو سر بسجود ہوئے مگر شیطان نے نہ مانا۔ اور خدا سے قیامت تک کی مہلت مانگی کہ میں تیرے نیک اور برگزیدہ بندوں کے علاوہ کہ وہ میرے بہکانے میں نہیں آئیں گے باقی سب بنی آدمؑ کو گمراہ نہ کر دوں اور ان کی جڑ نہ کاٹ دوں تو سہی! اللہ تعالیٰ نے اس کی رسی ڈھیلی کر دی اور کہا کہ اپنا سارا زور لگا، جو ہمارے سچے بندے ہیں ان پر تیرا قابو نہیں چلنے کا اور جو گمراہ ہو کر تیری پیروی کریں گے وہ تیرے ساتھ جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ روایت ہے کہ شیطان سانپ کی مدد سے جنت میں پہنچا آدمؑ وحوا کو بہکایا وہ شجرِ ممنوعہ کے قریب گئے۔ ناراضگی الٰہی ہوئی اور جنّت سے زمین پر اتارے گئے۔ حضرت آدمؑ نے توبہ و زاری کی تو گناہ معاف کر دیا گیا۔ اور یہی سنت آدمؑ مقرر ہوئی۔ اللہ پاک نے فرمایا زمین پر تم لوگوں کے پاس وقتاً فوقتاً ہماری طرف سے ہدایت آیا کرے گی جو ہماری ہدایت مانے گا اور راہِ راست پر چلے گا وہ ہلاکت سے بچے گا اور جو منہ موڑے گا وہ قیامت کے دن اندھا کر کے اٹھایا جائیگا اور دوزخ میں گرایا جائیگا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ان تمام نشانیوں کے پیچھے باطن کی راہ بھی تلاش کرنی ہے کہ آدمؑ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے اس کی روح پر بھی تو یہی واردات گزرنی ہیں۔

حضرت آدمؑ کی اولاد میں ہابیل نیک دل تھے، بھیڑ بکری چراتے تھے، قابیل دل کے کھوٹے اور حاسد تھے، کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ایک دفعہ دونوں نے اللہ کی نیاز دی، نیاز پہاڑ پر رکھی گئی، ہابیل کی نیاز کو بجلی نے لپٹا۔ گویا اللہ نے ہابیل کی نیاز قبول کر لی اور قابیل کی نیاز اللہ کو پسند نہ آئی کہ صدق نیّت سے نہ تھی، حسد میں قابیل نافرمان بنا۔ اس نے ہابیل کا خون کیا اور لاش دبا کر اس جگہ سے فرار ہو گیا۔ نسل انسانی میں نیاز کا صدق بھی ودیعت ہوا اور حسد، نافرمانی اور قتل بے گناہ کا جرم بھی۔

حضرت آدمؑ کے ایک اور بیٹے حضرت شیثؑ پیغمبر ہوئے۔ یہ ۱۳۰ سال آفرینش میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴۲ میں آپ نے انتقال کیا، گویا ۹۱۲ سال عمر پائی۔ انکے زمانے میں ۸۸۰ سال حضرت آدمؑ زندہ رہے۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت شیثؑ کو پیغمبری عطاء ہوئی اور آپ اپنی طویل عمر میں صرف ۱۱۲ سال پیغمبری پر فائز رہے۔ انکی قوم کھیتی باڑی کرتی تھی۔ اور صلح و آشتی پر کاربند تھی اس لئے قابیل کی اولاد میں سے بیشتر حضرت شیثؑ کی تعلیم کے طفیل راہِ راست پر آ گئے۔ البتہ حضرت شیثؑ کے انتقال کے بعد شیطان نے قوم کو نئی گمراہی میں لگایا۔ اب تک جو خرابی نسلِ انسانی میں قابیل کے ذریعہ آئی تھی وہ تھی نافرمانی، حسد، بغض اور قتلِ ناحق۔ اب حضرت شیثؑ سے جو لگاؤ تھا اور آپ کی تکریم جو قوم نے کی اُس کو گمراہی کی شکل ایک نئی طرح پیش آئی۔ ان صفات کے اظہار کیلئے جن سے حضرت شیثؑ متصف تھے، قوم نے آپ کے بعد یہ ذریعہ سوچا کہ حضرت شیثؑ کا بت بنا لیا۔ مقصد تقدیس و تکریم کرنا تھا۔ دل میں یاد رکھنا اور اپنی نیاز مندی کا ذریعہ مقرر کرنا تھا لیکن اسی نے رفتہ رفتہ بُت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ قوم حضرت شیثؑ کا بُت بنا کر پوجنے لگی۔ دنیا میں یہ پہلا بُت تھا (بعض کتب میں ہے کہ پہلا بُت حضرت ادریسؑ کا تھا) صفاتِ الٰہی جن کا ظہور پُرانوار حضرت شیثؑ کی معصوم ذات میں ہوا ان کو تعیّناتِ جسمانی کا پابند کر دینا گویا ذاتِ مجمع الصفات کو اس طرح مادّی جسم میں محدود کر دینا تھا۔ اللہ تعالےٰ کی تو یہ مرضی تھی کہ اولادِ آدمؑ اس کی نیابت اور قُربّ حاصل کریں۔ صفاتِ الٰہی کے مظہر بن کر خلیفۃ اللہ کے مصداق ہو کر اس دنیا میں اپنی زندگی گزاریں، مگر ہوا یہ کہ عالمِ انسانیّت اپنی ترقی اور معرفت حقیقت کی راہ میں پتّھر کا

بُت حائل کر کے بیٹھ رہی۔ اپنے میں اُس کو پا کر توحید کا نقشہ پیش نہ کر سکے۔ اپنے سے اسے علیحدہ کر کے دوئی اور شرک کیا۔ ابھی حضرت آدمؑ اور حضرت شیثؑ زندہ تھے کہ ۶۲۲ سالِ آفرینش میں حضرت ادریسؑ (اخنوع) پیدا ہوئے۔ یہ حضرت آدمؑ کی چھٹی پشت میں تھے۔ دنیا میں علمِ نجوم، علمِ ریاضی، فنِ کتابت، کپڑا سینا، ناپ تول، فنِ اسلحہ سازی اوّل اوّل آپ نے ہی شروع کیا۔ اور ظاہر ہے کہ تائیدِ غیبی سے یہ ممکن ہو سکا ہو گا۔ انسانی وجوہ میں دماغ انسانی کا یہ کارنامہ اس بات کیطرف اشارہ کرتا ہے کہ عالم الاسماء ہونیکی حیثیت سے انسان کو یہ فطری صلاحیت حاصل ہوئی ہے کہ اپنے عقل وحواس کے ذریعہ دریافت، ایجاد، فنکاری اور علم کے نئے کرشمے دکھائے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قلب ورُوح کی صلاحیتوں کے ذریعہ کیا کچھ انسان کے دست قدرت میں ممکن نہیں۔

حضرت ادریسؑ ۳۶۵ سال کی عمر میں یعنی ۹۸۷ سال آفرینش میں آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ حضرت شیثؑ ابھی زندہ تھے۔ قرآن کریم نے حضرت ادریسؑ کے صبر ورضا کی تحسین کی ہے۔ آپکی عالی صفات بیان کی ہیں۔ آپ کی پاکیزگی، پرہیزگاری اور سیرت کی تعریف کی ہے۔ آپ پر اللہ کی رحمتوں کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ادریسؑ کے بعد ان کی قوم کچھ عرصہ ہدایت پر قائم رہی لیکن بالآخر کافی زمانہ گزرنے کے بعد بُت پرست ہوگئی۔ حضرت ادریسؑ کے بعد بھی پچپن ۵۵ سال حضرت شیثؑ اور زندہ رہے۔ اس لئے اولادِ آدم میں ہدایت کا سامان بفضل ایزدی قائم تھا۔ حضرت شیثؑ کے انتقال کے ۱۴ سال بعد حضرت نوحؑ پیدا ہوئے یہ وہ وقت تھا کہ قوم بُت پرستی کی طرف مائل ہونے لگی تھی۔ اپنے توہّمات اور مادّی ہواو ہوس میں گرفتار تھی۔

حضرت نوحؑ جب تک پیغمبری پر فائز ہوئے قوم کافی گمراہ ہو چکی تھی۔ اسکا نتیجہ تھا کہ باوجود اسکے کہ آپکی عمر ۹۵۰ برس ہوئی اور عرصہ دراز تک آپ وعظ ونصیحت کرتے رہے مگر صرف ۸۰ غریب لوگ مسلمان بن سکے۔ ظاہر ہے کہ وعظ ونصیحت کی دسترس محدود ہے اور ہدایت منِ جانبِ اللہ کے لئے عاجز قلوب اور محبت کے لگاؤ کی ضرورت تھی جو اس زمانہ میں مفقود تھا۔ حضرت نوحؑ نے قوم کو پیغام دیا کہ میں تمہیں بھلائی کی بات بتاتا ہوں، بُرے

کاموں کے عذابوں سے ڈراتا ہوں، میں اس بھلائی کے بدلے کوئی انعام تم سے نہیں مانگتا۔ میں اللہ سے اپنا صلہ لوں گا۔ حضرت نوحؑ نے برسوں تک لوگوں کو نصیحت کی مگر نہ ماننے والوں نے بالآخر یہی کہا کہ اگر تم سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو لے آؤ۔ حضرت نوحؑ نے خدا سے عرض کی ''میں انہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا انہوں نے نہ مانا۔ یہ گمراہ قوم ایمان لانے والی نہیں۔ اب تُو انہیں ایسا تباہ کر کہ زمین پر ان کا نشان نہ رہے۔ یہ زندہ رہے تو ان سے جو نسل چلے گی وہ کافر و بدکردار ہو گی'' عقل کی سطح پر کوشش کا اثر قلوب پر کم ہی ہوتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق جب قوم بدلتی نظر نہیں آتی تو یہی خیال آتا ہے کہ موجودہ بُرے لوگ ہٹ جائیں تو پھر شاید ان سے بہتر انسان آئیں یا ایک قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں کوشش کی جائے تو شاید وہاں کامیابی کی امید ہو۔ انسان کیا اور اس کی بساط کیا۔ بالآخر یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ بغیر تائید غیبی کے نہ تبلیغ و پیغام میں اثر آتا ہے نہ لوگوں کے قلوب میں پیام اترتا ہے۔ غرض حضرت نوحؑ جب تنگ آ گئے تو شوقِ طلبِ حقیقت کے تنور نے ان کے سینے میں جوش مارا۔ اُدھر غضب الٰہی کی صورت میں آسمان سے پانی برسنا شروع ہوا اور ایسا کہ بند ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ چالیس دن رات طوفان رہا۔ پانی ہر طرف اتنا چڑھا کہ حضرت نوحؑ کی کشتی مہینوں تیرتی رہی۔ جب پانی اترنا شروع ہوا تو ساتویں مہینے حضرت نوحؑ کی کشتی کوہِ جودی (ارارات) پر موصل کے قریب عراق میں رُکی۔ طوفان نوحؑ ۱۶۵۶ سال آفرینش میں آیا۔ اس وقت حضرت نوحؑ کی عمر ۶۰۰ برس کی تھی۔ طوفان کے اور ۳۵۰ سال بعد تک حضرت نوحؑ زندہ رہے۔ اب جو بچے ہوئے لوگ تھے وہ پھیلنا بڑھنا شروع ہوئے۔ انہوں نے کھیتی باڑی بھی کی۔ انگوروں کے باغ بھی لگائے اور صلح و آشتی کی زندگی بھی گزاری۔ اسی لئے حضرت نوحؑ آدمِ ثانی کہلائے۔

حضرت نوحؑ ابھی زندہ تھے کہ ۱۷۲۳ سال آفرینش میں حضرت ہودؑ پیدا ہوئے، حضرت ہودؑ کے زمانے میں بھی حضرت نوحؑ اور ۲۱۳ سال زندہ رہے۔ حضرت ہودؑ نے ۴۶۴ سال عمر پائی، وہ قومِ عاد کی ہدایت فرماتے رہے۔ قوم عاد بہت قد آور قوم تھی۔ اس نے بڑی قوّت حاصل کی۔ صنعت و حرفت میں کافی ترقی کی اور ایسی خوبصورت عمارتیں بنائیں کہ عقل

دنگ رہ جاتی تھی۔ اپنے اسی ہنر پر یہ قوم نازاں ہوکر مغرور اور نافرمان بن گئی۔ اور ساتھ ہی بُت پرست بھی۔ عقل و ہنر کی بدولت انسان کمالاتِ تخلیق دکھاتا ہے اور ساتھ ہی اپنے تخلیق کئے ہوئے بتوں کو اپنا خالق بنا بیٹھتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کے درمیان اپنی میزان قائم نہ رکھ سکنے کی بناء پر یہ گمراہی ہوتی ہے۔ گویا ہدایت بھی اپنے اندر ہوتی ہے فروغ بھی اپنے اندر ہوتا ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کے اظہار کے اسباب اور توفیق بھی اپنے اندر ہوتی ہے۔ اور ہر چیز میں اپنی انانیت کا دعوی کر بیٹھنے پر وہ توازن ٹوٹ جاتا ہے جو انسان کو فطری طور پر ودیعت ہوا ہے۔ الغرض قوم عاد اپنی عقل کے خود ساختہ قابلیت کے جال میں پھنس کر گمراہ ہوئی۔ حضرت ہودؑ نے فرمایا۔ ''تم صرف خدائے واحد کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ میں یہ وعظ و نصیحت تمہاری بھلائی کیلئے کرتا ہوں۔ تم سے میں اس کا کچھ بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر پروردگار خود عطا کریگا۔ اے لوگو! کیا ہمیشہ دنیا ہی میں رہنا ہے؟ کہ بلاضرورت ایسی اونچی اونچی اور پختہ عمارتیں بناتے ہو۔ تم نے اپنا دل سراسر اسی کام میں لگا رکھا ہے۔ تمہیں دین کا بھی کچھ خیال چاہیے۔ یہ نصیحت اس لئے تھی کہ دینی اور دنیوی عروج دونوں کی جو صلاحیتیں انسان کو ودیعت ہوئی ہیں انکو میزان میں رکھتے ہوئے زندگی گزارنا تھی۔ مگر قوم نے اپنی عقل و دانش پر بھروسہ کرتے ہوئے ان باطنی نعمتوں کو برباد کیا جن کے سہارے معبود سے رشتہ قائم ہوتا ہے۔ حضرت ہودؑ کو قوم نے جھٹلایا۔ مذاق اڑایا۔ انکی باتوں کو حماقت کہا۔ آخر ان کو عذاب نے آ گھیرا۔ تین سال کیلئے ان پر بارش بند ہوگئی۔ جس کی بناء پر سخت قحط پڑا۔ اس پر بھی رُخ اللہ کی طرف نہ ہوا۔ تو پھر سیاہ گھٹا اُٹھی اس میں کڑک کی آواز آئی۔ سخت طوفان آیا۔ اور آٹھ دن ایسی آندھی چلی کہ اونچے اونچے مکان، محل اور عمارتیں سب گر گئیں اور ساری کی ساری قد آور قوم عاد فنا ہوگئی۔ صرف حضرت ہودؑ اور ان کے مومن رفیق بچ سکے۔ حضرت ہودؑ کے وقت میں ہی شدّاد نے جنت بنائی تھی لیکن اس میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ پھر طوفان میں اس کے سب ساتھی معہ بہشت ختم ہو گئے۔

ابھی حضرت نوحؑ کی ۲۴۹ سال عمر باقی تھی کہ قومِ ثمود کی طرف سے دوسرے پیغمبر حضرت صالحؑ بھیجے گئے۔ یہ قوم حجاز میں آباد تھی اور سنگ تراشی میں اس نے کمال حاصل کیا

تھا۔ انہوں نے پہاڑ کھود کر عالیشان مکان بنائے اور ان پر نقش و نگار کئے۔ حضرت صالحؑ انکی طرف آئے کچھ عرصہ تو انہوں نے حضرت صالحؑ کی بات مانی مگر پھر نافرمان ہو گئے۔ حضرت صالحؑ سے معجزہ مانگا کہ پہاڑ پھٹ کر اونٹنی پیدا ہو۔ وہ نکلتے ہی سرخ بالوں کا بچّہ دے جو اسی وقت بڑا ہو جائے تا کہ ہم اسی اونٹنی کا دودھ پئیں۔ حضرت صالحؑ نے ایسا ہی معجزہ کر دکھایا۔ تو کچھ عرصہ کیلئے وہ خاموش ہو گئے پھر پانی کا ایک قحط ایسا پڑا کہ پانی پلانے کے لئے اونٹوں کی باریاں مقرر کرنا پڑیں۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا تھا کہ اسی طرح اُس سرُخ اونٹنی کی باری پانی پر رہے گی۔ ان لوگوں نے اپنے دل کی کدورت اس اوٹنی پر نکالی۔ اسکی پنڈلیاں کاٹ دیں جس سے وہ مرگئی۔ نشانی الٰہی کو اس طرح ٹھکرانے کے باوجود نرم دِل پیغمبر نے اس قوم کی معافی طلبی کیلئے ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے کہا کہ اب بھی توبہ کر لو کہ قہر الٰہی سے بچو۔ مگر وہ نہ مانے۔ آخر چوتھے دن آسمان سے ہولناک کڑک ہوئی اور صبح کو وہ سب لوگ مردہ پائے گئے۔ حضرت صالحؑ اور انکے ساتھی جو ان پر ایمان لائے تھے بچ گئے۔ اس قسم کی تائید الٰہی سے مومنین کے دل اور بھی پختہ ہو گئے کہ تمام قوّت و قدرت تو بالآخر اللہ کے ہاتھ ہے اور وہی سب سے بہتر پالنے والا اور حفاظت کرنے والا ہے۔

طوفانِ نوح کے بعد زمانہ پر کچھ صدیاں گزر گئیں۔ قوم عاد بھی ہوئی اور قوم ثمود بھی۔ انسان نے اپنی صلاحیتوں کے مادّی کارنامے تو کافی دکھائے مگر روحانی سطح پر سوائے چند مومنین کے باقی انسانیت نافرمان ہی ہوتی گئی۔ لہٰذا وہ خیال کہ اگر خراب انسانیت ختم ہو جائے تو شاید پھر نئی انسانیت ایمان پر قائم کی جا سکے غلط ہی نکلا۔ فطرت انسانی میں تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو موجود ہیں۔ اسی انسان میں مادّی اور روحانی عروج کی صلاحیتیں موجود ہیں، شیطانی اور رحمانی انداز اسی انسان میں پائے جاتے ہیں بات صرف یہ ہے کہ باطن کا چراغ روشن کر دیا جائے تو تاریکی خود غائب ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جو کچھ کرنا تھا باطن کی سطح پر کرنا تھا۔ تاریخ کا الٹ پھیر اسی لئے چلتا رہا۔ اور جب تک انسان نے اپنے باطن کے اندر غوطہ زنی کر کے یہ چراغِ ہدایت پا نہ لیا دین کی تکمیل نہ ہو سکی۔ باطن کی جانب رجوع ہونے کا سب سے پہلا انداز حضرت ابراہیمؑ کا تھا۔ اس لئے آپ کو فضیلت عطاء ہوئی۔ یہ سلسلہ

ارتقائے باطن کا حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ میں خصوصی طور سے انسانیت کیلئے نشانِ راہ بنا اور اس کی تکمیل حضور نبی کریم صلی اللہ وعلیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ حضرت نوحؑ کے انتقال کے ۲ سال بعد پیدا ہوئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت نوحؑ کے انتقال کے ۱۷ سال بعد تک حضرت صالحؑ اور ۱۷۷ سال بعد تک حضرت ہودؑ زندہ رہے۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بھی یہ پیغمبر موجود تھے۔ حضرت ابراہیم ۲۰۰۸ سال آفرینش میں پیدا ہوئے اور ۲۱۸۳ سال آفرینش میں آپ کا انتقال ہوا۔ گویا آپ نے ۱۷۵ سال عمر پائی حضرت ابراہیمؑ ۷۰ سال کے تھے کہ حضرت صالحؑ کا انتقال ہوا۔ حضرت ہودؑ نے البتہ طویل عمر پائی اور آپ کا انتقال حضرت ابراہیمؑ کے بھی ۴ سال بعد ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ انسانیت کے پیشوا ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے'' بے شک ابراہیمؑ لوگوں کے امام اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک ہی کے ہو رہے تھے۔ انکو اپنی رحمت سے بہت سی چیزیں عطا کیں اور ان کا ذکر جمیل بلند کیا اور ان کی پیشوا بنا دیا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انکو اولاد میں پیغمبری کر دی اور ان کو دنیا میں بھی انکا صلہ عنایت کیا اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔'' حضور نبی کریمؐ نے بھی فرمایا کہ ''میں ابراہیمؑ کے دین اور شریعت کے احیاء کیلئے مبعوث ہوا ہوں۔'' حضرت ابراہیمؑ کے روحانی تجسّس کا انداز گویا باطن کی طرف رجوع ہونا تھا۔ اور آپ نے اسی سطح سے عالمِ انسانی کی ہدایت کے لئے راہ کھولی۔ آپ کی فراستِ ایمانی ہی کے ذریعہ لوگوں پر تخلیق بالحق کی حقیقت واضح ہوئی۔ خود آپ کو یہ فہم آسمانوں اور زمین کے عجائبات دیکھ کر اور ان پر غور وخوض کر کے حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ تخلیقِ کائنات پر غور وتفکّر سنت ابراہیمی ہی کا انداز ہے۔ اسی تدبر کے طفیل انسان پر یہ رمز آشکار ہوتا ہے کہ یہ سارا پراز حکمت، نفع بخش اور محکم نظام، کسی بالاتر قانونِ خلقت کے تحت وجود میں آیا ہے اور یہ نظام ایسے زبردست حکیم وعلیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام فلکی اور انکی ماہیت سے پورا پورا واقف ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ۱۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ آپکے بیٹے حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ آخر وقت میں آپ کے

قریب تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ تقریباً ۲۱۲۰ قبل مسیح شہر آور میں پیدا ہوئے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ کی جائے پیدائش تھی۔ حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی زیر نگرانی تربیّت پائی۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے مختلف سفروں میں ساتھ رہے۔ ۲۰۸۵ قبل مسیح میں جب حضرت لوطؑ کی عمر ۳۵ سال تھی تو آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی معیّت میں پہلے حاران پھر کنعان ہجرت فرمائی۔ وہاں قحط پڑا تو حضرت ابراہیمؑ نے آپ کو سدوم بھیج دیا جو بحرِ مردار کے قریب اُردن کی وادی میں ایک سرسبز مقام تھا۔ یہیں آپکو نبوّت عطا ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد سدون پر چار بادشاہوں نے ملکر حملہ کیا اور حضرت لوطؑ کو معہ مال و متال کے پکڑ کر لے چلے۔ حضرت ابراہیمؑ کو خبر ہوئی تو آپ نے دشمنوں کا تعاقب کر کے شکست دی اور حضرت لوطؑ پھر سدوم واپس آ گئے۔ سدوم چونکہ خوشحال ملک تھا اس لئے یہاں کے لوگ خدا سے غافل ہو کر اخلاق سوز حرکتوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان لوگوں کو بہکانے کیلئے شیطان نے ایک نیا خیال انکے دماغوں میں ڈالا وہ یہ کہ انکے سرسبز علاقوں میں جو غیر قومیں گھس آئی تھیں۔ ان کو دور رکھنے کے لئے ان کے نوعمر لڑکوں کو ستایا جائے تو پھر وہ بڑے ہو کر کبھی ادھر کا رخ نہ کریں گے۔ رفتہ رفتہ یہی بدکرداری انکی عادت بن گئی۔ قوم کو اس غلط کردار سے باز رکھنے کیلئے حضرت لوطؑ تن دہی سے انکی فہمائش میں لگ گئے۔ مگر نہ انہیں ماننا تھا نہ مانے۔ یہ بھی مشیت الٰہی ہوتی ہے کہ اس کے علمِ میں اگرچہ پہلے سے یہ ہوتا ہے کہ کوئی ذمہّ داری جو پیغمبر یا ہادی کو سونپی جاتی ہے اس میں کامیابی نہیں ہوگی۔ مگر ایک طرف قوم پر اتمامِ حجت کر دی جاتی ہے اور دوسری طرف پیغمبر کی استقامت اور صبر کا نمونہ بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے کہ باوجود اسکے کہ عقلِ ظاہر کے اعتبار سے وہ ذمہّ داری جو اُسے سونپی گئی ہے مُمکن العمل نہیں، پھر بھی شرطِ بندگی، شرطِ نیاز مندی کا یہی تقاضا ہے کہ وہ بوجھ ضرور اٹھالیا جائے جو یار کی طرف سے اُسے سونپا جا رہا ہے۔ سوال یا شک و شبہ کے اظہار کی گنجائش، محبت کے اس تعلّق میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ الغرض حضرت لوطؑ اپنے کام میں لگے رہے۔ قوم کے ساتھ فہمائش سے کام نہ بنا تو ان کے کاموں سے بیزاری دکھائی۔ اس پر وہ ان کے پیچھے لگ گئے اور شہر بدر کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔

حضرت لوطؑ نے انہیں خدا کے غضب سے ڈرایا کہ ایک تو خدا کے حکم کی نافرمانی کر رہے تھے اور دوسرے اُس کے پیغمبر پر ظلم کرنے پر آمادہ تھے۔ غیرتِ الٰہی کو تو جوش میں آنا ہی تھا۔ آپ نے بہت سمجھایا کہ دیکھو عذاب کو کیوں اس طرح اپنے اُوپر مقرر کراتے ہو مگر انہیں پیغمبر پر یقین کب تھا۔ کہنے لگے۔ دیر کیا ہے۔ وہ عذاب لے آؤ۔ حضرت لوطؑ نے بھی جان لیا کہ اس قوم کے دل میں خدا کے خوف کا شائبہ تک نہیں رہا۔ اس لئے عذاب ضرور آئے گا۔ آپ نے دعا کی ''اے میرے پروردگار مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کاموں سے نجات دے۔ اے میرے پروردگار ان شریر لوگوں کے مقابلے میں مجھے نصرت عطا فرما'' حضرت لوطؑ کی دعا قبول ہوئی۔ فرمانِ الٰہی کے مطابق جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ پہلے ابراہیمؑ کے پاس پہنچے انہیں حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی بشارت دی پھر اطلاع دی کہ ہم سدوم کی بستی کو تباہ کرنے جا رہے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ چونکہ طبعاً نرم دل تھے اس لئے فرشتوں سے جھگڑنے لگے کہ کیا خدا بدوں کے ساتھ نیک لوگوں کو بھی ہلاک کر دے گا۔ کم از کم لوطؑ تو نیک ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا اے ابراہیمؑ یہ خیال چھوڑ دو پروردگار کا حکم آ پہنچا ہے۔ اس قوم پر ضرور عذاب آنے والا ہے جو کبھی نہیں ٹلے گا۔ جو نیک لوگ اس بستی میں ہیں ہمیں سب معلوم ہیں ہم لوطؑ کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے ان کی بیوی کے کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہو گی۔ فرشتے حضرت ابراہیمؑ سے رخصت ہوئے اور خوبصورت لڑکوں کی شکل میں سدوم پہنچے۔ حضرت لوطؑ کی قوم نے انہیں دیکھ لیا۔ اور پیچھے لگ گئے حضرت لوطؑ نے ان تین لڑکوں کو اس قوم کے شر سے محفوظ رکھنے کیلئے اپنے گھر میں پناہ دی۔ پھر بھی لوگوں نے آ کر گھر کو گھیر لیا۔ حضرت لوطؑ نے لوگوں کو کافی فہمائش کی مگر وہ لوگ اب تشدّد پر آمادہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ دروازے توڑ کر اندر داخل ہو جائیں۔ حضرت لوطؑ گھبرائے۔ محبوبِ حقیقی کب اپنے بندے کو ایسا پریشان دیکھ سکتا تھا۔ تائیدِ غیبی، عذاب کی صورت میں آئی۔ گھر کو جن لوگوں نے گھیر رکھا تھا وہ اندھے ہو گئے لاکھ وہ ٹٹولتے رہے گھر کا دروازہ انہیں نہ مل سکا۔ بجائے خوفزدہ یا ہراساں ہونے کے وہ اور ضد میں آئے کہ شاید لوطؑ نے ان پر کچھ کیا ہے اور اس کی تِکّا بوٹی کر ڈالیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب اسی حالت میں انہیں ختم ہونا ہے۔ فرشتوں نے حضرت لوط

ؑ کو پیامِ خداوندی بتایا اور کہا رات ہی میں اپنے گھر والوں کو اس بستی سے لے کر نکل جائیں اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ صبح ہوتے ہی اس شہر کی تباہی ہے۔ قرآن کریم میں ہے ''جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس بستی کو نیچے اُوپر کر دیا۔ اور ان پر پتھر، کنکریاں تہ بہ تہ برسائے، جن پر تمہارے پروردگار کے یہاں سے نشان کئے ہوئے تھے۔'' یہ عذاب ۲۰۶۱ قبل مسیح آیا۔ انبیاء علیہم السلام کے یہ واقعات جو آگے آنے والی قوموں کیلئے بیان کئے گئے ہیں اور قرآنِ کریم کے یہ ارشادات غور و تفکّر چاہتے ہیں۔ آخر ان واقعات اور ان الفاظ کے پیچھے کیا نشانیاں ہیں جن کا یہ بیان ہو رہا ہے۔ انبیاء ارتقائے باطن کی مختلف کڑیاں ہیں اور ہر نبی کا ورود زمانے کے لحاظ سے عین مطابقت رکھتا ہے۔ اسی لئے جو خصوصی وارداتیں نسلِ انسانی میں ظہور پذیر ہوتی رہیں انکا کسی نہ کسی حد تک تعلّق آگے آنے والی انفرادی اور قومی زندگیوں تک ضرور ہے۔

عذاب آیا تو حضرت لوطؑ اور اُنکے گھر والے بچا لئے گئے اس لئے کہ حضرت لوطؑ نے ان کیلئے بھی دعا کی تھی۔ صرف حضرت لوطؑ کی بیوی ہلاک ہوئی کہ اس نے بستی سے جاتے وقت مڑ کر دیکھا تھا۔ گو ظاہری نظر سے حضرت لوطؑ تبلیغ و ہدایت کے سلسلے میں کچھ بھی نہ کر پائے پھر بھی قرآن کے مطابق ان کے مقبولِ بارگاہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ ارشاد ہے ''اور اسمٰعیل اور الیسعؑ اور لوطؑ اور ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی اور انکو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا راستہ بھی دکھایا تھا۔''

حضرت اسماعیلؑ ۲۰۷۴ قبل مسیحؑ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۷ قبلِ مسیح میں آپ نے رحلت فرمائی۔ حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت آپ کی عمر ۸۹ سال تھی۔ آپ کا پیدائشی وطن کنعان ہے مگر آپ کو مع والدہ کے حضرت ابراہیمؑ نے حجاز میں چھوڑا۔ وہیں آپ نے سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ آپکی پیدائش حضرت ابراہیمؑ کی دعا پر ہوئی کہ ''پروردگار مجھ کو نیک فرزند عطا فرما۔'' قرآنِ کریم میں قربانی کے واقعہ کا ذکر یوں ہے۔

> ''باپ نے کہا اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم کو ذبح
> کر رہا ہوں، دیکھو تم کیا سمجھے ہو، بیٹے نے کہا میرے باپ! جو حکم دیا

گیا ہے کر گزریئے۔ انشاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے''

حضرت ابراہیمؑ نے خواب سچا کر دکھایا اور آزمائش میں پورے اترے اس لئے کہ اپنے جگر گوشے، اور مدتوں کی تمناؤں اور بڑھاپے کی دعاؤں کے بعد پیدا ہونے والی اولاد کو خود اپنے ہاتھ سے اللہ کے نام پر ذبح کر دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ حضرت ابراہیمؑ کا استقلال اور حضرت اسمٰعیلؑ کی سعادت اس عالی مرتبے کی تھی کہ آواز آئی

''اے ابراہیمؑ تو نے خواب سچّا کر دکھایا۔''

رحمت باری سے حضرت اسماعیل کی جگہ ایک دنبہ عطا ہوا جو بالآخر حضرت ابراہیمؑ نے ذبح کیا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ''بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی'' باطن کی جانب رجوع اور ارتقائے باطن کی یہ ظاہری نشانی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کا دنبہ، حضرت موسیٰؑ کی گائے، حضرت عیسیٰ کا صلیب سے اٹھالیا جانا، حضورؐ کی اونٹ کی قربانی، ارتقاء کی کڑیوں کا اظہار تھیں۔ اسکی تکمیل ذبح عظیم، قربانی حسینؓ تھی۔ اسلام کا باطنی ارتقاء اس لحاظ سے ہو رہا تھا جس کا اہل اُن انبیاء کی قوموں کا زمانہ تھا۔ ہر قوم کو جس ارتقائی منزل تک پہنچایا گیا، اسکا اظہار یہ قربانیاں تھیں۔ حضرت ابرٰاہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے وقت میں باطنی طور پر انسان کو نفس اور لطیفۂ نفس کی منازل عبور کرا کے قلب کی منزل تک پہنچا دیا گیا تھا۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں عروج روح کی منزل پر ہوا۔ ان کا صلیب پر سے اٹھالیا جانا اسی کی نشانی تھی۔ قلب کی منزل سے روح کی منزل میں قدم اسی طرح رکھا جا سکتا ہے کہ بس اٹھالیا جائے۔ یہاں اپنی کوشش اپنے مجاہدے، اور اپنی تڑپ سے کچھ نہیں بنتا۔ حضور نبی کریمؐ کے زمانہ میں رُوح کی منازل طے کر کے غیب تک رسائی، دشتِ ہُو میں سفر، ذات سے رابطہ، شدّت شوق کے قلندرانہ انداز ہی اس رمزِ خفی اِخفا کی عُقدہ کشائی کرتے ہیں۔ حضرت ابرٰاہیمؑ کا انداز قلندرانہ تھا۔ اس شدّت قلندرانہ میں انسانی قربانی پیش کرنا چاہی۔ لیکن ابھی وقت نہ تھا کہ تکمیل باطن انسانی ہو جائے اس لئے دُنبے کی قربانی نسلِ انسانی کے باطنی ارتقاء کے لحاظ سے قبول ہوئی، اور یہی رنگ موسیٰؑ کی گائے کی قربانی کا تھا پھر حضرت عیسیٰؑ نے صلیب پر چڑھ کر انسانی قربانی پیش کرنا

چاہی۔ اسکے لئے بھی ابھی وقت نہ تھا۔ کیوں کہ ارتقاء کا تقاضا یہی تھا کہ آہستہ آہستہ منازل در منازل نسلِ انسانی اپنے عروج سے ہم کنار ہو۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بار ۲۷ اونٹوں کی قربانی دیکر اُمتِ جمعیّت کی جانب سے اس ذبحِ عظیم کی طرف اشارہ فرمایا جو کربلا کے میدان میں قبول ہونے والی تھی۔ کربلا کے ۷۲ شہداء عزمِ انسانی اور عروجِ باطنِ انسانی کے آنے والی نسلوں کیلئے گواہ مقرر ہوئے۔ اسلام کا عروج جمعیّت بندی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہی تکمیل پا سکتا تھا۔ اس لئے باطنِ عالمِ انسانی کی تکمیل انا امتی اندازِ رہبری، اور امت کے امتزاج سے ہوئی۔ تمام انبیاء کا انداز اپنی اپنی امت کے رنگ میں رنگا تھا۔ جب امتوں نے بھی اپنے کو اس سطح تک اٹھالیا جس کے لئے ہادیانِ دین سلسلہ بہ سلسلہ آتے رہے تو کہیں انسان جمعیّت کے انداز میں اپنی قربانی پیش کرنے کے قابل ہوا۔ تب ہی وہ زندۂ جاوید ہو کر نسبتِ محمدیؐ سے ہادیٔ زمانہ کہلانے کا مصداق ہوا۔ یہ تو تھا قربانیوں کا انداز جو حیات انسانی کے باطنی ارتقاء کے مدراج کی نشان دہی تھیں،

؎ لی معلّیٰ قرب وقربانی ہیں انجام حیات

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسمعیلؑ کی قربانی پر آمادگی ظاہر کرکے، مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ کے اصول پر کاربند رہنے کا سبق نسلِ انسانی کو عطا کیا۔ ''توکّلتُ الَی اللہ'' کی دوسری شاندار مثال حضرت ابراہیمؑ ہی نے پیش کہ بی بی ہاجرہؑ اور اسمعیلؑ کو اپنے سے جُدا کیا اور بہ باطن اپنے اسی توکلّ کی بنیاد پر اسلام کیلئے اس جگہ کی بنیاد رکھ دی جو بعد میں آماجگاہِ خلائق ہونے والا تھا۔ اللہ کا حُکم اس سلسلہ میں پا کر حضرتِ ابراہیمؑ اپنی بیوی ہاجرہؑ اور اسمعیلؑ کو لے کر چلے۔ ایک مشکیزہ پانی کا دے کر انہیں فاران کے بیابان میں چھوڑ دیا۔ مشکیزۂ آب نشانی تھی آبِ رحمت کی، اور فاران کی چوٹی اس منزل کی جہاں سے نورِ رحمت بہ شکلِ رحمت للعالمین بعد میں جلوہ گر ہونے والا تھا۔ جب بیوی کو اس بیابان میں چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ جانے لگے تو بی بی ہاجرہؑ بولیں، ''ابراہیم ہم کو کس پر چھوڑے جاتے ہو۔'' آپ نے فرمایا ''اللہ پر'' تو ہاجرہ بولیں ''تو میں اللہ پر راضی ہوں۔'' حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی۔ ''اے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے اور میری اولاد کو بُت پرستی سے بچائے رکھیو ــــــ ''اے

پروردگار میں نے اپنی اولاد کو اس میدان میں جہاں کھیتی نہیں تیرے عزت والے گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ اے پروردگار تا کہ یہ نماز پڑھیں۔'' بعض محققین کا کہنا ہے کہ اس جگہ پہلے بھی حضرت ابراہیمؑ کا گزر ہوا تھا۔ اور اس مقدس مقام پر کعبہ کیلئے نشانی کا ایک پتّھر رکھ دیا تھا۔ جس کے گرد اس زمانہ کی نماز یعنی ذِکر و طواف آپ نے فرمایا تھا۔ اور اس طرح جہاں بھی حضرت ابراہیمؑ جاتے اور قیام کرتے، عبادت کیلئے ایک پتھر کی نشانی رکھ دیتے۔ اس دفعہ جو بی بی ہاجرہؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو آپ یہاں لائے تو اللہ کی نگہبانی میں چھوڑ کر اور ایک مشکیزہ پانی کا دیکر چل دئے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ پانی ختم ہو جانے پر جب بی بی ہاجرہؑ، صفا مروہ پہاڑیوں کے درمیان دوڑیں تو یہی سنّتِ ہاجرہ حج کے ارکان میں شامل کر دی گئی۔ حضرت اسمٰعیلؑ نے شدّتِ پیاس میں ایڑیاں رگڑیں تو یہیں چشمۂ زمزم جاری ہو گیا۔ بی بی ہاجرہؑ نے اس کی حد بندی کر کے حوض سا بنا دیا اور اس کے گرد ایک قافلہ آ کر ٹھہر گیا۔ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا تھا کہ اگر ہاجرہؑ اس طرح چشمے کو نہ روکتیں تو بہتر تھا کہ ایک چشمہ جاری ہو جاتا۔ حضرت اسمٰعیلؑ اسی جگہ پلے بڑھے اور آپ کی شادی بھی ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے سفروں میں کبھی کبھی ادھر کا بھی رُخ فرماتے رہے۔ ان ہی سفروں میں سے ایک میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں نے ملکر اس مقدس مقام پر پہلے سے کعبہ کی نشانی تھا بیت اللہ تعمیر کیا۔ انداز یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیلؑ پتھر دیتے جاتے اور حضرت ابراہیمؑ بناتے جاتے جب بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو دونوں نے ملکر اس کے گرد طواف کیا اور دعا کی ''اے پروردگار ہم کو اپنا فرماں بردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے ایک گروہ کو مطیع بنائے رکھیو'' ــــــ ''اے پروردگار ان ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے'' ــــــ خانہ کعبہ کی تعمیر ہو چکی تو حج و قربانی کے احکام نازل ہوئے اور خانۂ کعبہ کی خدمت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے سپرد ہوئی۔ حضرت اسماعیلؑ کو ''رسولاً نبیاً'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی بارہ اولاد تھیں جن سے بارہ ۱۲ قبیلے ملکِ عربؔ میں پھیلے۔ یہ بھی جاننے کی بات ہے کہ حضرت یعقوبؑ بن حضرت اسحٰقؑ کی اولاد بھی بارہ تھی جن سے بارہ بنی اسرائیل کے قبیلے

پھیلے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے جلیل القدر صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے۔ یہ بی بی سارہ کے بطن سے ۲۰۶۰ سال قبل مسیح پیدا ہوئے۔ حضرت اسحٰقؑ کی جائے پیدائش و رہائش اور جائے وفات مُلکِ شام ہی ہے جس وقت آپ کی ولادت ہوئی اسوقت حضرت ابراہیمؑ بوڑھے تھے اور بی بی سارہ بھی ۹۰ سال کی بوڑھی تھیں اور بانجھ تھیں۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی کہ آپ کے ایک صاحبِ علم و دانش فرزند ہوگا تو حضرت ابراہیمؑ اور بی بی سارہؑ دونوں کو تعجب ہوا۔ اس پر ارشادِ باری ہوا ''کیا تم خدا کی قدرت پر تعجب کرتے ہو۔'' اس سلسلے میں قرآن کریم کا ایک اور ارشاد ہے۔ ''ہم نے ان کو اسحٰقؑ اور اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کی بشارت دی'' حضرت اسحٰقؑ جوان ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے آپ کی شادی چالیس سال کی عمر میں اپنے خاندان بمقام حاران میں بی بی ربّ قہ سے کر دی۔ بیس سال بعد بی بی ربّ قہ کے بطن سے دو جڑواں بچے حضرت یعقوبؑ اور عیسوا دوم پیدا ہوئے۔ بڑے ہو کر عیسوا تو ماہر شکاری ہوئے اور حضرت یعقوبؑ نے پیشہ چوپانی اختیار کیا۔ کنعان میں قحط پڑا تو حضرت اسحٰقؑ نے وہاں سے مصر کو ہجرت کرنے کا خیال کیا۔ تورات کے مطابق آپ کو وحی آئی کہ ''مصر کو نہ جا بلکہ جو ملک میں تجھے بتاؤں اس میں رہ۔ تو اسی ملک میں قیام رکھ اور میں تیرے ساتھ رہوں گا۔ تجھے برکت بخشوں گا کیوں کہ میں تجھے اور تیری نسل کو یہ سب ملک دونگا اور میں اُس قسم کو جو میں نے تیرے باپ ابراہامؑ سے کھائی پورا کرونگا۔'' چنانچہ آپ نے وحیِ الٰہی کے مطابق لبنان کے جنوب میں ملک جرار کو ہجرت کی اور وہاں زراعت شروع کر دی جس میں خدا نے برکت دی۔ اس لئے آپ متمول ہو گئے۔ اپنی زندگی میں آپ نے اپنی قوم کو راہِ ہدایت پر لگائے رکھا۔ آپ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ بیس سال اپنے ماموں کے پاس حاران میں رہے۔ اس دوران میں آپ کی دولت میں ترقی ہوئی اور خدا کی برکت شاملِ حال رہی۔ حاران میں حضرت یعقوبؑ نے چار شادیاں کیں۔ اس زمانہ کی شریعت کے مطابق اپنی ماموں زاد بہنوں لیاہ اور راحیل سے ایک ہی وقت میں آپ کی شادی ہوئی اور ان بیویوں نے اپنی اپنی اولاد بڑھانے کیلئے اپنی مرضی سے اپنی ایک ایک

کنیز کی شادی بھی حضرت یعقوبؑ سے کر دی۔ بی بی راحیل کے بطن سے حضرت یوسفؑ اور بن یامین پیدا ہوئے اور دوسری بیویوں سے دوسری اولاد۔ جب حاران کے قیام کو بیس سال گزر گئے تو حضرت یعقوبؑ اپنے والد کے وطن کنعان (شام) کی طرف معہ بچوں کے چلے گئے۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا اس لئے آپ کی اولاد بنی اسرائیلؑ کہلائی۔ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسمعیلؑ کی اولاد بنی اسمعیلؑ کہلائی۔ ان ہی کی اولاد سے حضور نبی کریمؐ مبعوث ہوئے۔

اس جگہ یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے بعد دین کے نشر اور اسکے فروغ کے دو راستے ظہور میں آئے ایک وہ جو حضرت اسمعیلؑ نے پکڑا کہ حالات سے متاثر ہوئے بغیر اصلِ اصول پر قائم رہنا۔ اور اصلِ اصول کے مطابق ہی حالات کو ڈھالنا۔ اس کی وجہ آپ کی وہ پرورش تھی جو بی بی ہاجرہ نے عشقِ الٰہی کے توکلؑ پر بے برگ وگیاہ میدان میں کی۔ ظاہر سے قطع نظر کر کے دین کی سادگی کو باطن کی روشنی میں اپنانا۔ بنیادِ کعبہ کی سادگی اور آلِ اسمعیلؑ کا ان ہی اصولوں پر اپنی حیات کو ڈھالنا، اس کی واضح دلیل ہے۔ اسی لئے آلِ اسمعیلؑ میں وہ نبیوں کا سلسلہ نہیں رہا جو آلِ اسحٰقؑ میں تھا۔ آلِ اسحٰقؑ نے جس راہ پر قدم رکھا وہ یہ تھی کہ حالات کے مطابق اصولِ دین کو مصلحتِ وقت کے مطابق ڈھالتے رہے۔ اس لئے ظاہر تھا کہ دین کی راہ باطن سے ہٹ ہٹ کر ظواہر سے اثر پذیر ہوتی رہی اور قوم کو میزان پر قائم رکھنے کیلئے نبی در نبی اس قوم بنی اسرائیل کی جانب بھیجے جاتے رہے۔ توریت بھی آئی، زبور بھی آئی اور تقریباً ہر زمانہ میں ایک نہ ایک نبی اس قوم کو ہدایت پر رکھنے کیلئے لگا رہا۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کیا تھا کہ شاندار ہیکلِ سلیمانی اور رسومِ شرع قوم کا نظریۂ حیات بن گئے۔ وہ تلاشِ حقیقت کے لئے فکرِ براہیمی، وہ تجسّس، وہ تڑپ کا رنگ قوم سے بالکل مفقود ہو گیا۔ پابندیٔ احکام کی فکر نے کبھی قوم کو لطیفۂ نفس کی سطح سے ہی نہ بڑھنے دیا۔ اور اس لئے منازلِ قلب و رُوح کی جانب رجوع جس کی فطری صلاحیّت انسان کے باطن میں ہے ان کے لئے ایک بے معنی سی بات ہو کر رہ گئی۔ الغرض یہی دو اندازِ دین آنے والی نسلوں کے لئے کچھ مقرر سے ہو گئے۔ ایک گروہ ہر مذہب میں ایسا رہا کہ اس نے اصلِ اُصول کے مطابق حالات کو

ڈھالا اور ایک طبقہ ایسا رہا جس نے اصلِ اصول کو حالات کی روشنی میں ڈھالا۔ آلِ اسحٰقؑ و یعقوب کا یہی طریق رہا۔

حضرت یعقوبؑ کے فرزند حضرت یوسفؑ ۱۹۲۷ قبل مسیح پیدا ہوئے اور ۱۸۱۷ء قبل مسیح آپ نے انتقال فرمایا۔ حضرت یعقوبؑ کو اپنے بارہ بیٹوں میں سے سب سے زیادہ محبت حضرت یوسفؑ سے تھی اور یہی بات سوتیلے بھائیوں پر گراں گزری۔ انہوں نے حضرت یوسفؑ کے بچپن میں انہیں بہانے سے جنگل لے جا کر اندھیرے کنوئیں میں ڈال دیا اور گھر آ کر حضرت یعقوبؑ کو کہہ دیا کہ انہیں بھڑیا کھا گیا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کو نورِ باطن سے اللہ پر ایمان تھا اس لئے فرمایا ''نہیں بلکہ تم اپنے دل سے یہ بات بنا لائے ہو۔ اب صبر ہی بہتر ہے اور اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں'' اس وقت حضرت یعقوبؑ کی عمر ۹۰ سال تھی اور حضرت یوسف ۱۷ سال کے تھے۔ حضرت یوسفؑ کنوئیں میں تھے تو امدادِ غیبی حضرت یعقوبؑ کی دعا کی مقبولیت، اور آپ کی ازلی مقرر کردہ پیغمبری کی بنا پر اس طرح پہنچی کہ ایک قافلہ پانی کی تلاش میں کنوئیں پر آیا۔ انہوں نے حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا اور مصر کے بازار میں لے جا کر فروخت کر دیا۔ منشائے ایزدی کچھ اور تھا۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے ''جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو دانائی اور علم بخشا اور نیکوکاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں'' مصر میں جس شخص نے حضرت یوسفؑ کو خریدا اس نے بادشاہ کے حضور اس غلام کا تحفہ پیش کیا۔ اس طرح حضرت یوسفؑ کی بادشاہ کے دربار میں رسائی ہوئی اور ایسی مقبولیت ہوئی کہ بالآخر حکومت کا انتظام آپ ہی کے سپرد کر دیا گیا۔ لیکن اس مرتبے تک پہنچنے کیلئے آزمائشیں بھی سخت ہوئیں۔ حضرت یوسفؑ نے کنعان میں خواب دیکھا تھا اور حضرت یعقوبؑ کو یہ خواب بتایا تھا کہ چاند، سورج اور گیارہ تاروں نے سرِ نیاز خم کیا ہے۔ اس خواب کا اشارہ یہی تھا کہ حضرت یوسفؑ کو وہ برگزیدگی حاصل ہوگی کہ والدین اور بھائی سرِ نیاز خم کریں گے۔ مصر کے بادشاہ کے محل میں رسائی ہوئی تو عزیزِ مصر کی بیوی زلیخا کی نظر آپ پر پڑی اور فریفتہ ہو گئی۔ وہی کیا دوسری عورتوں نے بھی جب حضرت یوسفؑ کو دیکھا تو بے اختیار چلا اٹھیں، ماشاء اللہ یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ عورتوں نے جو گھیرا تو حضرت یوسفؑ نے اپنے خدا سے

پناہ مانگی، اے خدا یہ جو بات چاہتی ہیں اس سے تو مجھے قید خانہ پسند ہے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ بی بی زلیخا کی جھوٹی شکایت پر حضرت یوسفؑ معتوب ہوئے اور قید خانے میں ڈال دئے گئے۔ یہ قید آپ کو ۱۲ برس گزارنا پڑی۔ یہیں آپ نے دوسرے قیدیوں کے خوابوں کی صحیح تعبیریں دیں۔ اور مشہور ہو گئے۔ خوابوں کی تعبیریں صحیح بیان کرنا۔ آج تک نسبتِ یوسفی کے طفیل حاصل ہونا سمجھا جاتا ہے۔ تاویل الاحادیث اور خوابوں کی تعبیر کی عطائے الٰہی کے طفیل ہی حضرت یوسفؑ کو قید سے بالآخر نجات ملی عزیز مصر نے خواب دیکھا کہ سات موٹی تازی گائیں دریائے نیل سے نکلیں اور اسی دریا سے سات دُبلی پتلی گائیں نکلیں وہ ان موٹی گائیوں کو کھا کر بھی ویسی ہی دُبلی پتلی رہیں پھر اس نے دیکھا کہ سات سبز خوشے ہیں اور سات سوکھے۔ بادشاہ کے ایک خادم نے جو قید خانے میں حضرت یوسفؑ کے ساتھ کچھ عرصہ رہ چکا تھا بادشاہ کو حضرت یوسفؑ کے علم خواب کا پتہ دیا کہ ان کی بتائی ہوئی تعبیریں سچ ہوتی ہیں۔ چنانچہ بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو قید خانے سے نکلوایا اور خواب کی تعبیر دریافت کی اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی، آپ نے فرمایا کہ سات سال مصر میں بڑی کثرت سے غلہ پیدا ہوگا تمہیں چاہیے کہ جو غلہ کھانے میں استعمال ہو، اس کے علاوہ بچا ہوا غلہّ خوشوں میں چھوڑ دو۔ پھر اس کے بعد قحط و خشک سالی کے سات سال آئیں گے جو بہت سخت ہوں گے۔ ان سالوں میں تمہارا رکھا ہوا غلہّ کھا لیا جائے گا۔ صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جب خوب بارش ہوگی اور لوگ اس سے رس نچوڑیں گے۔ بادشاہ کے دل کو یہ بشارت ایسی صداقت والی لگی کہ حضرت یوسفؑ کا احترام اس کے دل میں پیدا ہوا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ حضرت یوسفؑ برگزیدہ آدمی ہیں اور حضرت ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کی اولاد ہیں تو اس نے عورتوں کے الزام پر سخت شبہ ظاہر کیا۔ اب بی بی زلیخا نے بھی بتایا کہ انہوں نے جھوٹا الزام یوسفؑ پر لگایا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی ذہانت اور وجاہت کو دیکھ کر بادشاہ نے ملک کے انتظام پر حضرت یوسفؑ کو لگا دیا اور آپ کی شادی اپنے بڑے پجاری کی لڑکی سے کر دی۔ جن سے منیٰ اور افرائیم پیدا ہوئے۔ آپ نے ایسا ملکی انتظام کیا کہ لوگ آپ کی جانب کھنچنے لگے۔ بہتر کاشت کرنے کے طریقے رائج کرا کے، اچھا بیج استعمال کرا کے

اپنے سات اچھے سالوں میں کافی غلہ جمع کرایا۔ پھر جیسے آپ نے فرمایا تھا قحط اور تنگی کے سات سال آئے۔ یہ قحط اتنا سخت تھا کہ اردگرد کے علاقوں میں بھی اس کی شدت تھی۔ حضرت یوسفؑ کی پیشگوئی سچّی دیکھ کر بہت سے لوگ آپ پر ایمان لائے۔ قحط کے زمانے میں آپ نے ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کا بھی۔ اس طرح خلقِ خدا کو بھوکوں مرنے سے بچالیا۔ قحط کا اثر کنعان پر بھی تھا جہاں آپ کے والد اور بھائی رہتے تھے وہ لوگ مصر کی خوش حالی کی خبریں سن کر غلہّ مانگنے کیلئے مصر پہنچے اور بن یامین کو حضرت یعقوبؑ کے پاس چھوڑ آئے۔ حضرت یوسفؑ نے غلہّ دینے کی یہ شرط رکھی کہ ان بھائیوں سے شمعون کو وہاں رکھ لیا اور تھوڑا غلہّ دے کر باقی کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ چھوٹے بھائی کو لے کر جب آؤ گے تو اور غلہّ ملے گا۔ بھائی جب دوبارہ آئے تو آپ اب کی بار حضرت یوسفؑ نے بن یامین کو روک لیا اور باقی کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ اب کی بار حضرت یعقوبؑ کو لاؤ گے تو اور غلہّ ملے گا۔ اس بار حضرت یعقوبؑ کے پاس حضرت یوسفؑ نے اپنی پیراہنِ بھیج دی۔ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کی جدائی میں برسوں روتے رہے اور روتے روتے اندھے ہو گئے تھے۔ جب غم زدہ یعقوبؑ نے پیراہن یوسفؑ کی خوشبو سونگھی تو آپ کی آنکھوں میں روشنی واپس آ گئی۔ حضرت یوسفؑ سے ملنے کی بے قراری میں اب کی بار حضرت یعقوبؑ معہ سب خاندان کے مصر پہنچے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۳۰ سال کی تھی اور اب ۱۷ سال کی عمر سے کھوئے ہوئے یوسفؑ سے اللہ نے ملایا۔ اب اس بشارت کی تعبیر ظہور میں آئی جو حضرت یوسفؑ نے بچپن میں دیکھی تھی یعنی کہ سورج، چاند اور گیارہ ستاروں نے انہیں سجدہ کیا ہے، حضرت یوسفؑ کے ساتھ حضرت یعقوبؑ ۷۰ سال رہے۔ جب حضرت یعقوبؑ کا آخر وقت آیا تو آپ نے حضرت یوسفؑ کو کہا کہ میری لاش کنعان میں دفن کرنا۔ آخر وقت میں حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود آپ کے باپ دادا، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی، جو معبودِ یکتا ہے۔ اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔ اسی طرح جب حضرت یوسفؑ کا ۱۱۰ سال کی عمر میں انتقال کا وقت آیا تو آپ نے بھائیوں کو بلا کر کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو اس ملک سے نکال کر اُس ملک

میں پہنچا دے گا۔ جس کے دینے کی قسم اس نے ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ سے کھائی تھی۔ سو تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لے جانا۔ اس وصیت پر عمل ان کے بھائیوں کے زمانے میں تو نہ ہوا اور کافی عرصہ تک حضرت یوسفؑ کی نعش ایک تابوت میں خوشبو بھر کر مصر میں رکھی رہی۔ البتہ چار سو سال بعد جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیکر مصر سے نکلے تو حضرت یوسفؑ کی وصیت کے مطابق آپ کی نعش بھی اپنے ساتھ لے لی اور بالآخر ارضِ مقدس میں سکم کے شہر میں دفن کی گئی۔ آپ کی بابت حضور نبی کریمؐ نے فرمایا یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحٰقؑ بن ابراہیمؑ کریم بن کریم ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ نسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ بزرگ یوسفؑ تھے کہ خود نبی تھے۔ نبی کے بیٹے، نبی کے پوتے اور نبی کے پڑپوتے۔

حضرت اسحٰقؑ کے ایک صاحبزادے عیص کے بیٹے حضرت ایوبؑ سترہویں صدی قبلِ مسیحؑ پیدا ہوئے، آپ کی والدہ حضرت لوطؑ کی بیٹی تھیں۔ جائے پیدائش اوری قبائل میں بُصری کے مقام پر خلیج عقبہ کے قریب، تھی ملکِ شام میں آپ کی رہائش رہی وہیں حضرت یوسفؑ کے بیٹے افراہیم کی لڑکی رحمت سے آپ کی شادی ہوئی، حسب و نسب اور تائیدِ الٰہی سے آپ اپنے قبیلے کے شیخ یا بادشاہ تھے، نہایت برگزیدہ اور راست باز تھے۔ اسی لئے اللہ نے آپ کو ہر قسم کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ آپ کثیر الاولاد تھے۔ آپ کے ساتھ بیٹے سات بیٹیاں تھیں، آپ کے پاس سات ہزار بھیڑیں، تین ہزار اونٹ، پانچ سو گدھے اور بے شمار نوکر چاکر تھے۔ جب آزمائش کا وقت آیا تو سب کچھ یکے بعد دیگرے ختم ہوگیا۔ غلام تو سبائی لوگوں نے حملہ کرکے تہ تیغ کر دئے۔ مویشیوں پر آسمان سے بجلی گری اور سب جل گئے۔ اونٹ دشمنوں نے قبضے میں لئے۔ اور گھر والے طوفان میں گھر کر ہلاک ہو گئے۔ گویا ساری خوشیاں یک دم اندھیرے اور غم میں تبدیل ہوگئیں۔ یکے بعد دیگرے یہ خبریں آپ کو پہنچیں تو آپ کی زبانِ مبارک سے یہی نکلا ''خدا کا تھا خدا ہی نے لیا، سب تعریف اسی قادرِ مطلق کے لئے ہے'' اسی لئے صبر ایوبی مشہور ہے اور یہی کیا۔ اب سب کچھ لٹ جانے کے بعد اپنے جسم کی باری تھی۔ چنانچہ آپ کو کوڑھ ہو گئی اور حالت یہ ہوگئی کہ لوگوں نے بستی سے باہر گھورے پر ڈال دیا۔ آپ کا یہ حال چند دن یا چند ماہ نہیں بلکہ پورے اٹھارہ سال رہا۔ اِس

زمانہ میں سب ساتھیوں نے ساتھ چھوڑا۔ صرف بی بی رحمت خدمت پر برابر لگی رہیں۔ اس تمام عرصہ بھی آپ کی زبانِ مبارک سے سوائے شکر کے الفاظ کے کچھ نہ نکلتا تھا۔ کیسا شکوہ، کیسی شکایت اپنے پروردگار سے ایسی محبت والی نسبت کہ اسکی طرف سے جو آیا وہ سکون قلب کا سامان بنا۔ صبر وشکر کی اس طویل آزمائش کے بعد ہی قرآنِ کریم نے حضرت ایوبؑ کو صابر کا لقب دیا ہے۔ رحمتِ باری اسی لئے آپ پر اتنی شدّت سے ہوئی کہ آپ کی ابتلا کا زمانہ ختم ہوا اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ دولت، عزت اور اولاد آپ کو عطا ہوئی۔ اسی لئے ارشاد باری ہے ''یہ ہماری طرف سے رحمت کا ظہور تھا، کیوں کہ رحمت کو پکارا گیا تھا۔ اور اس لئے کہ بندگی کرنے والوں کیلئے اس میں نصیحت ہو'' یعنی یہ حقیقت آشکار ہو جائے کہ جو عبادت گزار ہیں وہ کبھی رحمتِ الٰہی کی بخششوں سے محروم نہیں رہ سکتے۔ حضرت ایوبؑ نے ۱۴۰ سال کی عمر پائی اور ایسے پھلے پھولے کہ اپنی چوتھی پشت تک دیکھی۔

حضرت لوطؑ کی ایک بیٹی سے حضرت ایوبؑ پیدا ہوئے تھے اور دوسری بیٹی سے حضرت شعیبؑ۔ حضرت شعیبؑ تقریباً سولہویں صدی قبل مسیح شہر مدین میں پیدا ہوئے اور یہی آپ کی جائے رہائش رہی۔ آپ کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں حضرت ابراہیمؑ سے ملتا ہے اور آپ ہی حضرت موسیٰؑ کے سُسر ہیں۔ حضرت شعیبؑ اصحاب الایکہ اور اہلِ مدین کی طرف مبعوث ہوئے۔ یہ تجارتی قومیں تھیں اور ان میں دینی، اخلاقی، معاشرتی گمراہیاں تھیں۔ اسی لئے حضرت شعیبؑ برابر اُن کی ہدایت پر لگے رہے اور جن توہّمات اور باطل آرزوؤں کے بُت ان لوگوں نے بنا رکھے تھے ان کی جانب سے رُخ پھیر کر اللہ کی طرف رجوع کرتے رہے کہ ''اے قوم خدا ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اے قوم پچھلے دن آنے کی امید رکھو اور اپنے کردار کو درست کرو۔'' دینی اصلاح کے ساتھ آپ نے اُن کی دنیوی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی۔ ایک دوسرے کا حق رکھنے کے لئے اور اخلاقی، معاشرتی اور باہمی معاملات کی درستگی کیلئے بار بار تنبیہ فرمائی۔

''تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیل آچکی ہے تو تم ناپ تول پوری کرو، اور لوگوں کو اُنکی چیزیں کم نہ دیا کرو۔'' گویا ہر طرح لوگوں کی حق تلفی سے باز رکھنے کی

کوشش فرمائی۔ مگر اہلِ مدین کا یہی شیوہ رہا کہ ہر اصلاح کے بعد پھر خرابیوں پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آپ نے فرمایا ''زمین میں اصلاح کے بعد خرابی نہ کرو۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو یہ بات تمہارے لئے بہتر ہے۔'' اور تم راستوں پر مت بیٹھا کرو کہ جو شخص خدا پر ایمان لائے تم اُسے ڈراؤ اور راہِ خدا سے روکو اور اس میں عیب ڈھونڈو۔'' اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے تو خدا نے تم کو بڑھا دیا اور دیکھ لو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔'' الغرض خالَصَتةً لِلّٰہِ، ہی یہ تبلیغ تھی مگر اس سمجھانے کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا قوم کے ایک حصہ نے بالآخر آپکو جھٹلایا اور باپ دادا کے دین سے ہٹنے سے انکار کر دیا اس پر حضرت شعیبؑ نے پچھلی قوموں کی تباہی کی عبرت دلائی۔ اسکے نتیجہ میں وہ اور شدّت سے مخالف ہو گئے اور آپکو شہر بدر کرنے پر اتر آئے۔ حضرت شعیبؑ نے خدا کے انصاف کو پکارا۔ ہدایتِ غیبی پر حضرت موسیٰؑ نے بارہ ہزار کا لشکر انکی سرکوبی کیلئے بھیجا مگر اس سرزنش سے بھی کام نہ بنا۔ اب انکی مکمل تباہی کا حکم بارگاہِ الٰہی سے صادر ہوا۔ زلزلہ اور چنگھاڑ کی صورت میں عذابِ الٰہی نازل ہوا۔ اور صبح کو اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے ارشادِ باری ہے اور اب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیبؑ اور جو لوگ انکے ساتھ ایمان لائے تھے انکو اپنی رحمت سے بچا لیا'' یہ تو مدین والوں کا حشر ہوا۔ اب اصحاب الایکہ کی باری تھی۔ وہ لوگ بھی اسی انداز پر زندگی گزار رہے تھے جو مدین والوں کی تھی۔ یہ بھی تجارت پیشہ تھے۔ حضرت شعیبؑ ان کی اصلاح پر لگے رہے۔ آپ نے فرمایا ''تم ڈرتے کیوں نہیں۔ میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں اس کام کا تم سے بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ تو ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔'' اور پیمانہ پورا بھرا کرو۔ اور نقصان نہ کیا کرو اور ترازو سیدھی تولا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو اور اس سے ڈرو جس نے تم کو اور پہلی خلقت کو پیدا کیا۔'' اس تمام سمجھانے کے باوجود ان لوگوں نے حضرت شعیبؑ کو جھٹلایا اور کہا کہ ہمارا خیال ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا گراؤ۔ اس طرح ان لوگوں نے خود اپنے لئے اللہ کے عذاب کو پکارا اور جو عذاب انہوں نے طلب کیا تھا بالآخر وہی ان پر نازل ہوا۔ یہ عذاب بادل کی صورت میں مسلّط ہوا اور ان بادلوں سے آگ کی بارش ہوئی۔ وہ قوم تباہ ہوئی۔ صرف

حضرت شعیبؑ اور ان کے ساتھ مومنین کی جماعت عذابِ الٰہی سے محفوظ رہی۔ عام خیال یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ نے وہاں سے ہجرت فرمائی وہ حضرموت تشریف لے گئے اور وہیں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ نہایت خوش بیان تھے اور اپنی فصاحت کی بنا پر آپ کو خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے حضرت شعیبؑ، حضرت موسےٰؑ کے خسر تھے اس لئے کئی بار آپ کی حضرت موسیٰؑ سے ملاقات رہی۔ پہلی بار جب نبوّت سے قبل حضرت موسیٰؑ مدین آئے تو آپ کے ساتھ آٹھ برس رہ کر آپکی بکریاں چرائیں۔ تب حضرت شعیبؑ کی بیٹی صفورہ سے آپ کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ مصر کو تشریف لے گئے۔ اس بار آپ کو نبوت عطا ہو چکی تھی۔ کافی عرصہ بعد جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو آزاد کرا کے بیابان سینا میں پہنچے تو حضرت شعیبؑ زندہ تھے۔ انہوں نے آپکا استقبال کیا۔ یہاں حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو نصیحت کی کہ آپ اپنے پاس صرف تبلیغ شریعت کا کام رکھیے اور مقدمات میں سے صرف مشکل مقدمات آپکے پاس آیا کریں۔ بقیہ امورِ عدالت کا یہ انتظام کریں کہ ہر ایک ہزار افراد پر ایک حاکم مقرر کر دیں۔ پھر ایسے سو حاکموں پر ایک حاکم اور ایسے پچاس حاکموں پر ایک حاکم اور ایسے دس حاکموں پر ایک حاکم تا کہ یہ لوگوں کے مقدمات کا فیصلہ کیا کریں۔ اس وقت چونکہ بنی اسرائیل کی تعداد چھ لاکھ پچیس ہزار ہو چکی تھی اور یہ بارہ قبیلے تھے، حضرت موسیٰؑ نے یہ مشورہ مان لیا۔

حضرت موسیٰؑ کی پیدائش مصر میں ۱۵۲۰ قبل مسیحؑ ہوئی اور ۱۴۰۰ قبل مسیح آپ نے انتقال فرمایا۔ حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر میں آباد ہو گئے تھے مگر رفتہ رفتہ فرعونِ مصر کے مظالم اس قوم پر ہونے لگے اور اس نے انہیں سختی کے کام کرانے اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کیلئے ایسا گھیرا کہ وہاں سے بنی اسرائیل کی خلاصی ممکن نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے فرعون کو آگاہ کر دیا تھا کہ ایک بچّہ پیدا ہونے والا ہے جو تیرے دین کو جھٹلائے گا اور تیری حکومت کو ہلا دے گا۔ فرعون نے اپنی حفاظت اسی میں سمجھی کہ سختی سے حکم دے دیا کہ تمام نوزائیدہ بچّوں کو اس کے اہلکار ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرتے رہیں۔ نصرتِ الٰہی

حضرت موسیٰؑ کی والدہ پر وحی کی صورت میں آئی۔ آپ کو وحی کے ذریعہ ہدایت ہوئی کہ بچّے کو ایک پٹاری میں رکھ کر، اللہ کے توکّل پر دریا میں ڈالدیں۔ چنانچہ آپکی والدہ نے یہی کیا۔ تائید غیبی اور مصلحت خداوندی کے تحت یہ پٹاری بہتی ہوئی فرعون کے محل میں پہنچی۔ وہاں فرعون کی خادماؤں نے اس خوبصورت بچّہ کو فرعون کی بیوی تک پہنچا دیا۔ فرعون اور اس کی بیوی بچّہ کی خوبصورتی دیکھ کر اس پر فدا ہو گئے۔ کاہنوں سے مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے کہا کہ بچّہ کے سامنے آگ اور سونا رکھ دیا جائے۔ اگر سونا اٹھا لے تو یہ وہی بچّہ ہے جس سے آپکو خطرہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب آگ اور سونا اس بچّے کے سامنے رکھے گئے تو قریب تھا کہ یہ بچّہ سونا اٹھالیتا کہ فرمانِ الٰہی سے حضرت جبرائیلؑ نے بچّہ کا ہاتھ آگ کے انگارے کی طرف کر دیا۔ بچّے نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ اس طرح منہ جل جانے سے بچّہ کی زبان میں لکنت تو آ گئی مگر جان بچ گئی۔ اب فرعون کے محل میں شہزادوں کی حیثیت سے حضرت موسیٰؑ کی پرورش ہوئی۔ جب آپ ایک سال کے ہوئے تو اسی زمانہ میں حضرت ایوبؑ کا انتقال ہوا۔ مصر میں حضرت موسیٰؑ کے دن اچھے گزر رہے تھے کہ ایک دن ایک غریب بنی اسرائیلی کو بچانے کیلئے آپ نے ایک قبطی کے گھونسہ مارا جس سے وہ مرگیا۔ اب سوائے اس کے کچھ چارہ نہ تھا کہ تن تنہا مصر سے بھاگ نکلیں۔ چنانچہ تمام آرام و آسائش شہزادگی کو خیر باد کہہ کر اپنے مدین کی طرف رُخ کیا۔ وہاں پہنچے تو ایک کنویں کے قریب حضرت شعیبؑ کی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ انکے پانی بھرنے میں جو آپ نے مدد کی تو انہوں نے سوچا کہ انکے جانور پالنے کیلئے یہ خادم مل جائے تو بوجھ ہلکا ہو۔ الغرض حضرت شعیبؑ کی خدمت میں پیش ہوئے اور انکی خدمت پر ہی لگ گئے۔ آٹھ سال گزرنے کے بعد حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی صفورہ سے آپ کی شادی ہوئی، مدین کے قیام کے دوران ہی آپ کو نبوّت عطا ہوئی اور نو معجزے عطا کر کے بذریعہ وحی الٰہی مصر بھیجے گئے کہ فرعون کے مظالم سے قوم بنی اسرائیل کو بچا کر لے آئیں۔ بنی اسرائیل تقریباً ۴۳۰ سال سے مصر میں غلامی میں گرفتار تھے۔ مصر پہنچے تو اپنے کو اللہ کا فرستادہ ثابت کرنے کیلئے فرعون کے ایما پر آپکو جادوگروں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ یدِ بیضا اور عصائے موسوی کے انوار دیکھ کر کافر دنگ رہ گئے۔ جادوگروں کے

سانپ آ پکے عصا نے اژدھا بنکر نگل لئے اب سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور فرعون کے پاس چارہ نہ رہا، آپ نے فرمانِ الٰہی پیش کیا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔ فرعون راضی ہوا تو آپ بنی اسرائیل کو لیکر سینا کی طرف چلے۔ بعد میں فرعون کا دِل پھر پلٹا کہ اسکے ہاتھ سے ہنر مند اور کام کرنے والے بنی اسرائیل غلام چھوٹے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس نے بحر قلزم عبور کرتے وقت آپ کو روکنا چاہا۔ یہ زمانہ ۱۳۶۰ قبل مسیح کا ہے۔ فرعون مع لشکر کے غرقِ نیل ہوا اور تابوتِ سکینہ کی حفاظت میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو دریائے نیل عبور کرالیا۔ اب بنی اسرائیل کی ۴۳۰ سالہ غلامی ختم ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ نے تمام قوم کو دشتِ سینا میں لا ڈالا۔ رحمتِ الٰہی عجب انداز میں اس قوم پر نازل ہوتی رہی۔ دھوپ سے بچانے کیلئے بادل کا سایہ رہتا۔ کھانے کیلئے آسمان سے من برستا جو سفید دھنیے کے دانوں کے برابر، اور شہد جیسی چیزیں تھیں۔ اور سلوٰی بٹیریں تھیں جو شام کے وقت اس جگہ آتی تھیں۔ اور یہ لوگ پکڑ کر کھاتے تھے۔ اس دشتِ سینا میں حضرت موسیٰؑ کے ضربِ عصا سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور بارہ قبیلے انکے گرد آباد ہونے شروع ہوئے۔ تبلیغ کا کام چونکہ بڑھ گیا تھا اور آپ کی زبان میں لکنت تھی اس لئے آپ نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی مجھے میرے بھائی ہارونؑ سے امداد پہنچا کہ وہ قوم کو اچھی باتیں تبلیغ کرتے رہیں۔ چنانچہ حضرت ہارونؑ کو نبوت عطا ہوئی، حضرت ہارونؑ کا سنہ پیدائش ۱۵۲۳ قبل مسیحؑ ہے اور وفات ۱۴۰۶ قبل مسیحؑ ہوئی۔ جب حضرت ہارونؑ قوم کی دیکھ بھال میں لگ گئے تو موسیٰؑ کو کوہِ طور پر اعتکاف کرنے کا موقع ملا۔ کوہ طور پر چالیس دن کے بعد اللہ تعالےٰ نے بلاواسطہ آپ کو کلام سے مشرف فرمایا، پھر دیدار بصورتِ تجلّی عطا ہوا۔ حضرت موسیٰؑ جب واپس میدان میں اترے تو دیکھا کہ قوم، سامری کے بنائے سونے کے بچھڑے کو پوج رہی ہے اور دولت کی پجاری ہوگئی ہے۔ اس زمانہ میں علمِ کیمیا کا بہت زور تھا۔ سامری نے اپنے ہنر کا سہارا لیکر سونے کا بچھڑا بنایا کہ اسکی خوبصورتی اور چمک دمک دیکھ کر لوگ اسکے آگے جھکیں۔ حضرت موسیٰؑ قوم کا یہ حال دیکھ کر اپنے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ پر اس قدر خفا ہوئے کہ ان کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ حضرت ہارونؑ نے کہا کہ میں نے قوم میں تفرقہ پڑ جانے اور کشت وخون ہو جانے کے خیال سے سختی نہیں کی۔ حضرت

موسیٰؑ نے بچھڑے کو جلا کر دریا میں پھینک دیا اور قوم کو گائے کی قربانی کرنے کیلئے کہا۔ تا کہ انہیں یہ باور ہو سکے کہ گائے ربّ و بیت کی نشانی ضرور ہے مگر ربّ و بیت کا مظہر نہیں ہو سکتی عالمِ انسانیت بھی اب اپنے باطنی ارتقاء میں اس سطح پر آ چکی تھی کہ اس قربانی کو نشانی بنا کر اس کی اگلی منزل کی طرف اسے گامزن کر دیا جائے۔ پہلی قربانی اسی سلسلہ کی حضرت ابراہیمؑ کی دُنبہ کی قربانی تھی۔ انبیاء کے کام اسرار و رموز سے پُر ہوتے ہیں ظاہر کی کوئی نشانی بنا کر اس طرح باطنِ انسانیّت کو ایک منزل پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ قوم میں اعتمادِ خودی کو استوار کر کے پھر حضرت موسیٰؑ ان کی فلاح و بہبود میں لگ گئے ادھر بدنصیب قوم دوسری گمراہی میں پڑ گئی اور یہ تھی ناشکری ان احسانات اور انعامات کی جو ان پر لگاتار حضرت موسےٰ کے طفیل ہو رہے تھے اب قوم نے عرض کی کہ ہم من و سلوٰی کھاتے کھاتے اکتا گئے ہیں مسور کی دال، لہسن، سبزیاں ہمیں دلوایئے حضرت موسیٰؑ ان کو کنعان (فلسطین) لے گئے یہ وہ سرزمین تھی جس کا وعدہ اللہ نے حضرت ابراہیم حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ سے کیا تھا اور جس کی بابت حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ نے نوید دی تھی۔ یہاں اس زمانہ میں ایک دراز قد قوم آباد تھی۔ عوج بن عنق ان ہی میں سے تھا۔ حضرت موسیٰؑ کی معیّت میں حضرت یوشعؑ اور حضرت کالب تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو ان دراز قد لوگوں سے جنگ کرنے کیلئے کہا مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ آپ نے بہت سمجھایا کہ یہ وہی ملک ہو سکتا ہے جس کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ سے ہوا تھا اور حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ اسی کی خبر دیتے چلے آ رہے تھے۔ قوم نے جواب میں یہی کہا کہ ہم میں تو لڑنے کی طاقت نہیں۔ تم اور تمہارا خدا ان سے جنگ کرو۔ اس پر عتاب الٰہی اس قوم پر ہوا۔ چالیس سال کیلئے ان کا داخلہ فلسطین میں ہو گیا۔ اور وہ چالیس سال دشتِ سینا میں اپنے اپنے قبیلوں کو لئے بھٹکتے پھرے۔ یہ زمانہ ۱۴۴۰ قبل مسیح سے ۱۴۰۰ مسیح تک کا ہے اب حضرت موسیٰؑ کی عمر ۱۲۰ سال ہو چکی تھی اور آپ کا آخری وقت آ گیا۔ آپکو اشارہ ہوا کہ ''یوشعؑ پر اپنا ہاتھ رکھ۔ وہ ایک شخص ہے جس میں رُوح ہے، اس کے لئے قوم کو وصیّت کر اور اپنی عزّت میں سے کچھ اس کے اُوپر ڈال دے تا کہ بنی اسرائیل کی ساری جماعت اس کی فرماں برداری کرے۔'' وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کوہ نبو کی چوٹی پر چڑھے جہاں یرُدن

پار سارا کنعان دکھائی دیتا تھا۔ خدا نے فرمایا تو یرُدن پار نہ کر سکا لیکن یہ ملک میں تیری نسل کو دوں گا جس کا ابراہیمؑ، اسحاق، یعقوبؑ کو وعدہ کیا ہے۔ میں تیرے بھائیوں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا'' یہ پیشین گوئی دراصل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی کیوں کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ہی حضرت ہارونؑ کا انتقال ۱۴۰۰ قبل مسیحؑ میں کوہ ہود پر ہوا۔ اب بنی اسرائیل کی ذمہّ داری حضرت یوشعؑ کے سپُرد ہوئی۔ آپ نے ۱۱۰ سال عمر پائی اور آپکی قیادت ہی میں بنی اسرائیل سے چالیس سال کا عتاب ختم ہوا۔ اب آپ مع قوم کے ارضِ مقدس فلسطین کے شہر اریحا میں داخل ہوئے۔ حضرت یوشیعؑ بن نون کے بعد قاضیوں کا زمانہ ہے جو چار صدیوں تک بنی اسرائیل کی قیادت کرتے رہے۔ ان میں شمعون، عالی اور شیموئیل مشہور ہیں۔ شموئیل کا زمانہ ۱۲۲۰ قبل مسیح سے ۱۱۰۹ قبل مسیح کا ہے۔

اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ ہے جو ۱۰۸۵ قبل مسیح میں بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے اور ۱۰۱۵ قبل مسیح آپ نے انتقال فرمایا۔ اس طرح آپ نے ستر سال عمر پائی۔ اس زمانہ میں فلسطین کا بنی اسرائیل کا بادشاہ طالوت تھا۔ آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیتؔ دیکھ کر طالوت آپ کا حاسد ہو گیا۔ اور خصوصاً اس واقعہ کے بعد جب کہ آپ نے دیوصفت فلسطینی انسان جالوت کی شیخی کو نیچا کر دکھایا۔ آپ نے پانچ پتھر اٹھائے اور گوپیا سے جالوت کو مارا۔ طالوت نے لوگوں کی نگاہوں میں حضرت داؤدؑ کو گرانے کے لئے یہ شرط پیش کر دی کہ اگر دو سو فلسطینیوں کی کھال لاؤ گے تو اپنی لڑکی کی شادی تم سے کر دوں گا۔ حضرت داؤدؑ نے یہ شرط پوری کر دکھائی اس شادی کے بعد آپ نے اپنی زندگی میں ایک اور شادی اُرپا سردار کی بیوہ سے کی۔ طالوت کے بعد قوم نے آپ ہی کو بادشاہ بنایا۔ یہ بادشاہت آپ نے تیس سال کی عمر سے ستر سال کی عمر تک کی۔ اور نبوّت سے بھی سرفراز ہوئے۔ آپ صاحبِ کتاب نبی ہیں۔ زبور آپ پر نازل ہوئی۔ اس میں خدا کی حمد و ثناء، دعائیں اور مناجاتیں ہیں۔ ان دعاؤں اور مناجاتوں سے حلاوت ایمانی اور رقتِ قلبی حاصل ہوتی ہے آپکی آواز میں وہ کشش تھی کہ لوگ آپ کے گرد جمع ہو جاتے۔ لحن داؤدی مشہور ہے۔ بانسری بجانے کا وہ

انداز تھا کہ جانور تک اس کو سُن کر مسحور ہو جاتے۔ آپ کا دلی ارادہ تھا کہ بیت المقدس یعنی ہیکل بناؤں۔ اس کے لئے آپ نے سب سامان بھی جمع کر لیا تھا مگر یہ ہیکل آپ کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں بننا تھا۔ جب آپکا آخری وقت آیا تو آپ نے حضرت سلیمانؑ کو ہیکل کے سلسلہ میں سب ہدائتیں دے دیں۔

حضرت سلیمانؑ کا زمانہ تخت نشینی ۱۰۱۵ قبل مسیحؑ سے ۹۷۵ قبل مسیح ہے۔ اس طرح آپ نے چالیس سال نہایت شان وشوکت سے حکومت کی۔ ایسا اقتدارِ دنیوی شاید ہی کسی انسان کو نصیب ہوا ہو۔ آپ کا تصرّف نہ صرف عالمِ انسانی پر تھا بلکہ حیوان چرند، پرند، اجنا، آپ کے تابع تھے۔ آپ کو جانوروں کی بولی آتی تھی۔ بہت سے واقعات جانوروں سے باتیں کرنے اور ان سے نصیحت حاصل کرنے کے آپ کی زندگی میں پیش آئے۔ آپ کی فہم وفراست کے بہت سے قصّے مشہور ہیں۔ یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ ہدہد پرند کی اطلاع پر آپ کو ملکۂ سبا بلقیس کا حال معلوم ہوا۔ وہ سورج پرست قوم سے تعلق رکھتی تھیں مگر بالآخر حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پہنچیں، مشرف بہ اسلام ہوئیں اور حضرت سلیمانؑ سے شادی ہوئی۔

حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس، ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کرائی۔ دوسرے ملکوں سے صنّاع بلا کر عالیشان عمارت بنوائی گئی۔ اس کی چار دیواری سفید، سبز، زرد پتھروں کی تھی۔ صنوبر کے تختوں سے اگلا سامنے کا حصّہ مزّین کیا گیا۔ اور ان پر فرشتوں کی تصویریں کندہ کی گئیں۔ مسجد کی چھت میں سونا، چاندی، موتی، لعل، ہیرے، یاقوت، فیروزے اور طرح طرح کے بیش قیمت جواہرات لگائے گئے۔ آپ کا تخت عجائباتِ عالم میں سے تھا۔ یہ ہاتھی دانت کا بنا تھا اور زرنگار تھا۔ اس پر چھ سیڑھیاں چڑھ کر پہنچنا ہوتا تھا۔ ان سیڑھیوں کے دونوں طرف چھ چھ شیر تھے۔ حضرت سلیمانؑ کا معمول تھا کہ ہر شام بیت المقدس جاتے اور شام کا کھانا روزہ دار غریبوں، درویشوں کو ساتھ بیٹھا کر کھاتے۔ یہ کھانا کیا ہوتا تھا۔ یہ نعمت خانے کا کھانا نہ تھا بلکہ یہ وہ کھانا تھا جو آپ خود زنبیلیں سی کر ان کو بیچ کر جو کا آٹا لیکر پکاتے۔ گویا بادشاہوں میں بادشاہ، درویشوں میں درویش، پیغمبروں میں پیغمبر تھے۔ آپکا انتقال ۹۷۵ قبل مسیحؑ ہوا اور کوہ صیہون پر اپنے والد داؤد علیہ السلام کے ساتھ دفنائے گئے۔

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل کے قبیلوں میں سے یہودا اور بنیامین قومیں سلطنت یہودا کے نام سے یروشلم سے وابستہ رہیں اور باقی قبیلوں نے جدا سلطنت اسرائیل کے نام سے قائم کی اور سامرہ دارالخلافہ مقرر کیا۔ یہ سلاطینِ اسرائیل ڈھائی سو سال رہے اور رفتہ رفتہ ان کا یہ حال ہو گیا کہ توریت پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور بت پرست علیحدہ ہو گئے۔ حالات کے مطابق اصولِ دین کو ڈھال ڈھال کر یہی کچھ ہو جانا تھا۔ حضرت داؤدؑ کے بعد ۵۹۸ قبل مسیح تک انیس بادشاہ تختِ سلیمان پر بیٹھے ان میں کچھ تو نیک تھے لیکن زیادہ تر بدکردار تھے۔ اسی لئے قوم گمراہی میں اور بُت پرستی میں مبتلا ہوئی۔ حالت یہ ہوئی کہ بیت المقدس کے اردگرد بتوں کی پرستش ہونے لگی۔ تازیانۂ قدرت بخت نصر کے حملے کی صؤرت میں رونما ہوا۔ ۶۱۰ قبل مسیح میں بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور بنی اسرائیل پر لوٹ مار کر کے قیامت ڈھا دی۔ پھر بخت نصر نے دوسری بار حملہ کیا اور تیسری بار ۵۸۸ قبل مسیح میں پھر لشکر لیکر چڑھ آیا۔ اسطرح بار بار قدرت کی طرف سے بنی اسرائیل کو اپنی طرف رجوع کرنے کیلئے جھٹکے لگتے رہے۔ اس بار تابوت سکینہ اور توریت کے نسخے بھی جلا دئے گئے۔ یہ وہی مقدس تابوت تھا جس کے ساتھ حضرت موسیٰؑ نے دریائے نیل پار کیا تھا اور قوم کو فرعونِ مصر کے ظلم سے چھڑایا تھا۔

بخت نصر کے پہلے حملے کے بعد ۶۰۶ قبل مسیح حضرت دانیالؑ کو نبوت ملی۔ آپ بنی اسرائیل میں ۷۲ سال تبلیغ فرماتے رہے۔ بخت نصر کے تیسرے حملے کے وقت یرمیا نبی بھی موجود تھے۔ آپ برسوں پہلے رو رو کر بنی اسرائیل کو ان کی بربادی کی خبریں دیتے رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے آخر وقت تک اتمامِ حجّت کر لی جاتی ہے۔ برابر انبیاء پر انبیاء ہادی پر ہادی بھیجے جاتے رہے تا کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ ان تک ہدایت نہیں پہنچی۔ اس کے علاوہ بار بار قہرِ خداوندی کا اظہار ہوتا رہا کہ قوم اسی کو دیکھ کر تائب ہو۔ بخت نصر کے حملے اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ اب اس کے پوتے شاہ بلشزار نے بابل کے تخت پر بیٹھنے کے بعد بیت المقدس کے متبرک سامان اور برتنوں کی بے حرمتی کرنی شروع کر دی۔ قوم کو غیرت تو اس پر بھی جوش میں نہ آئی۔ مگر جلالِ خداوندی نازل ہوا۔ دیوار پر ایسے

الفاظ دستِ غیب سے ظاہر ہوئے جن کے معانی دانیال نبی نے بادشاہ کو پڑھ کر سنائے کہ تیرے راج کے دن گئے۔ تو ترازو میں تولا گیا اور کم پایا گیا۔ تیری سلطنت ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی اور ایرانیوں کو مل گئی۔ چنانچہ اسی شب ایرانیوں کا لشکر چڑھ آیا۔ بادشاہ قتل ہوا۔ سائرس، بادشاہ ایران کی حکومت قائم ہوئی۔ اب سائرس حضرت دانیالؑ کے پیچھے لگا۔ آپ نے کہا کہ تم اہلِ بابل کے بت کی پرستش کیوں نہیں کرتے؟ حضرت دانیالؑ نے کہا ہمارا معبود تو زندہ خدا ہے۔ پجاریوں نے کہا کہ ہمارا بُت بھی زندہ ہے وہ کھانا کھاتا ہے۔ بُت کے آگے کھانا رکھا گیا مگر دانیالؑ نے پجاریوں کو ہٹوا کر مندر میں راکھ بچھوا دی اور باہر سے مندر پر قُفل لگوا دیا۔ جب قُفل کھولا گیا تو کھانا غائب تھا مگر پجاریوں کے پیروں کے نشان پکڑے گئے جو ایک چھپے ہوئے چور راستے تک جاتے تھے۔ اس طرح حضرت دانیالؑ نے ان لوگوں کو نیچا دکھایا۔ اب آپ ان کے دوسرے بت کی طرف رجوع ہوئے جو ایک اژدہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں بغیر تلوار کے اس اژدھے کو ماروں گا۔ چنانچہ آپ نے بہت سی رال پکوائی اور اس میں چربی اور بال ملوا کر گرم کیا۔ پھر اس کی گولیاں بنا کر اژدھے کے منہ میں ڈالدیں۔ وہ مصنوعی معبود پھٹ کر ٹکڑے ہو گیا بادشاہ تو اس بات کا قائل ہوا کہ پجاریوں نے جھوٹے معبود بنا رکھے تھے مگر اس کی قوم محل پر ٹوٹ پڑی۔ حضرت دانیالؑ کو ان کے حوالے کرنا پڑا۔ انہوں نے حضرت دانیال کو بھوکے شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا مگر چھ دن تک بھی انہیں شیروں نے نہ چھُوا بادشاہ اب صدق دل سے اُن کی اور ان کے خدا کی سچائی کا قائل ہوا۔ اب اس نے ان لوگوں کو جنہوں نے حضرت دانیال کو شیروں کے پنجرے میں ڈلوایا تھا اپنی صداقت دکھانے کے لئے شیروں کے پنجرے میں ڈالا۔ ان جھوٹے بُت پرستوں کو شیروں نے فوراً کھا لیا۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے ۲۵ سال بعد حضرت الیاسؑ کو ۹۵۰ قبل مسیح میں نبوت عطاء ہوئی نبوت کے ۱۴ سال بعد آپ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ آپ کے زمانے میں قوم گناہوں میں مبتلا تھی اور نیک بندوں کو قتل کر دیا جاتا تھا اس لئے آپ تن دہی سے قوم کی اصلاح پر لگ گئے۔ جب قوم نہ مانی تو آپ نے اُن کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ آپ نے یہ فرمایا کہ اگر راہ پر نہ آؤ گے تو خشک سالی آئے گی۔ اس وقت کے بادشاہ نے آپ کا یہ فرمان سن کر آپ کے قتل کا حکم

دے دیا۔ اس لئے آپ پہاڑوں میں چلے گئے اور ایک نالے میں چھپے رہے جہاں کوّے روٹی لا لا کر کھلاتے۔ پھر ایک روز آپ شہر چلے گئے۔ یہاں ایک بڑھیا باوجود قحط سالی کے آپ کو کھانے کو دیتی رہتی اور اسی بنا پر اس کے گھر میں برکت رہی۔ آپ کے فرمانے کے مطابق اس علاقہ میں خشک سالی آئی۔ ساڑھے تین سال بارش نہ ہوئی۔ پھر بھی لوگ شرارتوں سے باز نہ آئے۔ اس پر حضرت الیاسؑ کو حکم خداوندی ہوا۔ کہ بادشاہ سے مباہلہ کریں۔ دونوں نے دو بیل قربان کئے اور اپنے اپنے خداؤں کو پیش کئے۔ اسکا خدا جو پتھر کا تھا کیا کھاتا لیکن آپ کی نذر قبول ہوئی آسمان سے بجلی اتری جو لکڑی اور قربانی کو بھسم کر گئی۔ اس پر لوگ پھر سے خدا کے قائل ہوئے اور بارانِ رحمت شروع ہوئی۔ بادشاہ اس شکست سے خوش کیسے رہ سکتا تھا، اسی لئے عذابِ الٰہی اس صورت میں اس پر نازل ہوا کہ اس کی بیوی نے ایک غریب ہمسائے کو بے گناہ قتل کروا دیا۔ حضرت الیاسؑ کو معلوم ہوا تو بادشاہ کے پاس پہنچے اور کہا کہ کتے تیرا خون چاٹیں گے اور کتے ہی تیری ملکہ کا گوشت کھائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ حضرت الیاسؑ کے ذریعہ الیسعؑ کو برکت ملنے کا واقع یوں ہے کہ ایک دن حضرت الیاسؑ نے دیکھا کہ ایک نیک شخص چلا آ رہا ہے۔ جب آپ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس کے دل نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہل جلا کر، بیل کا گوشت پکا کر اللہ کی نیاز دی اور خود حضرت الیاسؑ کے ساتھ ہولیا۔ جب حضرت الیاسؑ کا آخر وقت آیا تو آپ چلتے چلتے دریائے یرُدن کے کنارے پہنچے۔ چادر لیکر دریا پر ماری، دریا پھٹ گیا اور خشک راستے سے آپ نے دریا عبور کیا۔ الیسعؑ ساتھ تھے۔ دریا پار جا کر آپ نے الیسعؑ کو کہا کہ میرے رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہیں جو مانگنا ہے مانگ لو۔ الیسعؑ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ جس روح پاک کی تجھ پر برکت ہے اسکی مجھ پر بھی ہو جائے اور تجھ سے دوگنی۔ حضرت الیاسؑ نے اس پر فرمایا کہ تو نے بڑا بھاری سوال کیا۔ اگر تو رخصت ہوتے وقت مجھے دیکھ لے گا تو تیرا سوال پورا ہوگا وگرنہ نہیں۔ اچانک آسمان سے آتشیں رتھ، آتشیں گھوڑے دونوں کے درمیان اترے اور وہ جدا ہو گئے۔ اسی وقت ایک بگولا اٹھا اور رتھ غائب ہو کر آسمان کو چلا گیا۔ یہ دیکھ کر الیسعؑ چلائے۔ اے میرے باپ، میرے باپ! مگر وہ پھر کچھ نہ دیکھ سکے۔ البتہ رتھ اُوپر اٹھتے وقت حضرت الیاسؑ کی چادر

زمین پر گر گئی۔ وہ الیسعؑ نے اٹھالی۔ اب الیسعؑ واپسی کیلئے یرُدن کے کنارے آئے اور چادر دریا پر ماری۔ دریا خشک ہوا اور انہوں نے دریا پار کیا۔ اس وقت سے خدا کی برکت ان کے ساتھ رہی اور ان سے بہت سے معجزے سرزد ہوئے جیسے نمک کا پیالہ چشمے پر الٹ دیا تو پانی اچھا ہو گیا بچوں نے چھیڑ میں گنجے سر والا الیسعؑ کہا اور دو ریچھوں جنگل سے نکل کر بیالیس لڑکوں کو پھاڑ گئیں۔

اس کے بعد حضرت یونسؑ کا زمانہ آیا۔ جب آپ کو نبوت ملی تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ کو نیکوکاری کی طرف رجوع کریں۔ اسکے بعد ملک اسیریا کے شہر نینوا جانے کا حکم ملا کہ وہاں کے لوگوں کی ہدایت کریں۔ یہ تقریباً ۸۰۰ سال قبلِ مسیحؑ کا زمانہ تھا اور حضرت الیاسؑ اور الیسعؑ کے سو سال بعد ہی بنی اسرائیل کی یہ حالت ہو گئی کہ بدکاری اور بُت پرستی میں گرفتار ہو گئے۔ حضرت یونسؑ کو امید نہ تھی کہ لوگ ان کی بات مانیں گے۔ اس لئے جب آپ کو حکمِ خداوندی ہوا تو بجائے نینوا جانے کے جہاز میں سوار ہو کر ترسیس کی راہ لی۔ یہ بات ناراضگی خداوندی کا سبب ہوئی۔ جہاز سخت آندھی میں پھنس گیا۔ مسافر اور ملاح سب خوفزدہ ہو کر اللہ کے حضور گریہ درازی کرنے لگے۔ حضرت یونسؑ بھی دعا میں شریک ہوئے مگر طوفان نہ رُکا۔ اب لوگوں کا خیال ہوا کہ ہم میں کوئی گناہ گار بندہ ہے۔ جس کے سبب یہ قہر نازل ہو رہا ہے۔ چنانچہ قرعہ نکالا گیا اور حضرت یونسؑ کا نام آیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیشک میں ہی خطاوار ہوں۔ مجھے سمندر میں ڈال دو مگر یہ لوگ اور بھی زیادہ اللہ کے حضور گریہ وزاری کرنے لگے کہ ہماری گردنوں پر خونِ ناحق کا وبال نہ ڈال۔ موسوی شریعت میں خونِ ناحق بڑا گناہ تھا۔ انکی دعاؤں کے باوجود جب طوفان نہ رکا تو دوسری جانیں بچانے کی خاطر انہیں حضرت یونسؑ کو سمندر میں ڈالنا پڑا۔ حضرت یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا اور طوفان ختم ہوا۔ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں اپنی خطاؤں کا اقرار کیا، آئیتہ کریمہ زبانِ مبارک سے جاری ہوئی اور سات دن بعد مچھلی نے کنارہ پر اُگل دیا۔ یہ واقعہ ۸۶۲ قبل مسیحؑ ہوا۔ اب آپ کو دوبارہ نینوا جانے کا حکم ہوا۔ آپ نے آبادی کے کنارے ٹھہر کر لوگوں کو تنبیہ کی کہ راہِ راست پر آ جاؤ۔ ورنہ چالیس دن میں تم پر عذاب آئے گا۔ لوگوں نے جب عذاب کا سنا تو تائب ہوئے۔ سب آبادی کے

لوگوں نے روزہ رکھا اور ننگے سر ہو کر دعا مانگی۔ ان کی توبہ قبول ہوئی۔ اور عذاب ٹل گیا۔ حضرت یونسؑ کو ان کی توبہ کا علم نہ تھا اس لئے جب وقتِ مقررہ پر عذاب نہ آیا تو آپ کو رنج ہوا کہ جھوٹے پڑے اور عرض کی بارِ الٰہی میں جانتا تھا تو عذاب بھیجنے میں دھیما ہے اسی لئے میں پہلے ہی ترسیس کو چلا گیا تھا۔ اب ایسی ندامت سے مر جانا ہی بہتر ہے۔ اللہ پاک نے اپنی قدرت سے حضرت یونسؑ کے چھپر کے پاس کدو کی بیل اگائی جس کے سائے اور سبزی سے ان کو تسکین ہوئی پھر اللہ کے حکم سے ایک کیڑا پیدا ہوا جو راتوں رات کدو کی بیل کو کھا گیا اور وہ جل جل کر سوکھ گئی۔ حضرت یونسؑ کو اس کی وجہ سے رنج ہوا تو اللہ پاک نے کہا کہ تم ایک کدو کی بیل کے سوکھ جانے پر اتنا رنج کرتے ہو اور میں نینوا کے ایک لاکھ بیس ہزار لوگوں پر رحم نہ کروں۔ خدا کی قدرت دیکھیں کہ نینوا تو تائب ہو کر عذابِ الٰہی سے بچا اور فضلِ خداوندی کا مستحق ہوا مگر بیت المقدس میں شرک اور شرارت اتنی بڑھی کہ رسولوں کو حقیر جانا گیا اور جھٹلایا گیا۔ اس شہر پر قہرِ خداوندی اس صورت میں نازل ہوا کہ شاہِ اسیریا نے سامرہ پر اچانک چڑھائی کی اور پورے تین برس تک اس شہر کو اس بلا نے گھیرے رکھا یہاں تک کہ سب لوگ اسیر کر کے اسیریا لے گئے۔ بنی اسرائیل اس وطن سے ایسے نکلے کہ پھر اس کا منہ صدیوں تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جو لوگ قید ہونے سے بچ گئے وہ آس پاس کے اقوام میں مل کر ختم ہو گئے۔ غرض وہ نو، دس قبیلے جن سے سلطنتِ بنی اسرائیل قائم تھی صفحۂ تاریخ سے ہمیشہ کیلئے مٹ گئے اُدھر باقی دو قبیلوں کی تخت و تاراج کا ذکر پہلے آ چکا ہے کہ کس طرح بخت نصر کے حملے سے سلطنت یہودا معہ تابوتِ سکینہ اور توریت کے نسخے کے ختم ہوئی۔ اس کے بعد یہودی قوم کیلئے رونا ہی رونا رہ گیا۔ قوم ذلیل و خوار ہو کر منتشر ہونے لگی۔ دینِ موسویؑ کا ڈھانچہ ہی ڈھانچہ رہ گیا۔ روحِ دین ختم ہو گئی۔ اب یہ قوم نئے پیغمبر کے انتظار میں صدیوں اللہ سے دعا کرتی رہی کہ موسوی دین کو پھر سے زندہ کر دے۔ بالآخر عمران کی بیوی کے ایک بچی پیدا ہوئی جس کا نام مریم رکھا اور اس نے اپنی منت کے مطابق اس بچی کو یروشلم کی عبادت گاہ پہنچا دیا۔ یہاں اب حضرت ذکریاؑ متولی تھے بی بی مریم جوان ہوئیں تو انہیں حضرت عیسیٰؑ کی خوش خبری دی گئی۔ آپ گھبرائیں کہ میں تو شادی شدہ بھی۔ نہیں اللہ تعالے نے

فرمایا۔ ''اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتا ہے ہوتا ہے۔ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ جاتا ہے۔''

حضرت ذکریاؑ ۸۰ سال کے تھے تو حضرت یحییٰؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی۔ ''آپ کی بیوی بھی بانجھ تھیں مگر قدرتِ الٰہی سے وہی ہوا جس کی بشارت دی گئی تھی حضرت یحییٰ کی والدہ بی بی مریم کی والدہ کی بہن تھیں۔ اس طرح حضرت یحییٰ بی بی مریمؑ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ خاندان حضرت ذکریاؑ کی سرپرستی میں یروشلم میں تربیّت پا رہا تھا۔ بنی اسرائیل کی حکومت بخت نصر اور ایرانیوں کے حملے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ اب یروشلم پر رومیوں کی حکومت تھی اور انہوں نے اپنی طرف سے ہیرو دیس کو بنی اسرائیل کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے دن اب قریب آ رہے تھے۔ ہیرو دیس نے سن رکھا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بادشاہ پیدا ہونے والا ہے، اس لئے اس نے بھی نمرود اور فرعون کی طرح بچوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ بی بی مریمؑ کو بیت الحم میں پناہ لینی پڑی۔ یہیں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے اور ظہور میں آنے کے بعد ہی اس روح اللہ نے اپنے نبی ہونے کا اعلان کر دیا۔ بچے کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کیلئے بی بی مریمؑ مصر چلی گئیں۔ اور ہیرودیس کی زندگی تک واپس نہ آئیں۔ ہیرودیس کے بعد ماں بیٹے یروشلم پہنچے ابھی آپ بارہ تیرہ برس ہی کے تھے کہ یروشلم کے عالموں سے ایسی باتیں کرتے کہ وہ ششدر رہ جاتے۔ اپنی والدہ کی طرح آپ کو بھی یروشلم کی عبادت گاہ ہی میں رہنے کا شوق تھا۔ جب تیس برس کی عمر میں آپ کو نبوت عطا ہوئی تو اس وقت سے قلندرانہ زندگی اختیار فرمائی۔ گاؤں گاؤں، بستی بستی آپ پھرتے رہتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ آپ کی آواز اور باتوں میں ایسی کشش تھی کہ جو سنتا خود بخود وعظ میں کھنچا چلا آتا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تین برس کے مختصر عرصہ میں لاکھوں لوگ ہدایت پر آئے۔ اخلاق کی پاکیزگی اور دل کی صفائی کے طریقے بتا کر آپ نے اللہ کی محبت اور عالم انسانیت اور غریبوں کی دلداری، مسکینی، اور عاجزی کی طرف لوگوں کو رجوع کیا۔ آپ کی تعلیم سے حواریوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو آپ کے ساتھ ساتھ رہتی۔ لیکن ایسے بھی بدباطن اسرائیلی تھے جن کو یہ محبت اور غربا پروری کا پیغام پسند نہ آیا۔ وہ حاسد ہوئے اور آپ کو ستانے

لگے۔ پھر بھی حضرت عیسیٰؑ صبر سے اُن کی طعنہ زنی برداشت کرتے رہے۔ دریائے اُردن کے کنارے آپ وعظ فرماتے اور یہیں حضرت یحییٰؑ بھی تبلیغ، وعظ و نصیحت کرتے۔

حضرت یحییٰؑ بچپن ہی سے عبادت الٰہی کے دلدادہ تھے۔ آپ یا تو عبادت میں مصروف رہتے یا لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے۔ ''لوگو۔ توبہ کرو۔ خدا کی بادشاہت قریب ہے۔'' آپ کی زندگی سادہ تھی۔ اونٹوں کے بالوں کی پوشاک پہنتے اور ایک چمڑے کا پٹکا کمر میں باندھے رکھتے۔ ٹڈی اور شہد آپ کی خوراک تھی جو جنگل سے مل جاتی۔ آپ کے وعظ اور کلام میں وہ تاثیر تھی کہ اُردن پار کے لوگ بھی آپکا وعظ سننے کیلئے آتے۔ شاہِ وقت کے دعا گو آپ اور آپ کے والد حضرت ذکریاؑ دونوں تھے۔ وہ ان پیغمبروں کی قدر بھی کرتا تھا مگر منظورِ الٰہی یہ تھا کہ اسی بادشاہ کے حکم سے بے خطا یہ باپ بیٹے شہید کئے گئے۔ اسکا واقعہ یوں ہے کہ بادشاہ وقت اپنی سوتیلی لڑکی پر عاشق ہو گیا شریعت کے مطابق یہ شادی جائز نہ تھی۔ لڑکی کی ماں ملکہ نے اپنی جان چھڑانے کیلئے یہ شرط رکھ دی کہ دونوں پیغمبروں حضرت ذکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کے سر اس کے سامنے پیش کئے جائیں، اس کا خیال تھا کہ بادشاہ جو پیغمبروں کی عزت کرتا تھا ایسا نہ کر سکے گا مگر بادشاہ پر عشق کا جنون سوار تھا، اس نے بے گناہ پیغمبروں کے سر کاٹنے کا حکم دے دیا جب بادشاہ کے آدمی یہ حکم پورا کرنے چلے تو حضرت ذکریاؑ پر یہ روشن ہوا کہ قاتل آتے ہیں، آپ بھاگے اور درخت سے پناہ مانگی۔ حضرت یحییٰؑ اونٹنی پر بیٹھ کر بھاگنے لگے۔ بادشاہ کے آدمیوں نے پکڑ لیا۔ اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ دیں اور حضرت یحییٰؑ کو شہید کر دیا۔ حضرت ذکریاؑ درخت سے پناہ مانگ کر اندر جا چھپے آپ کا کپڑا باہر رہ گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے درخت کو آرے سے چیرنا شروع کیا۔ اسوقت حضرت ذکریاؑ پر وحی آئی کہ اگر اف بھی کی تو پیغمبری سے خارج کر دئے جاؤ گے۔ چنانچہ ضعیف العمر معصوم پیغمبر آرے سے چیر دئے گئے۔

یہ تو ان پیغمبروں کا حال ہوا اب حضرت عیسیٰؑ پر جو گزری وہ یوں ہے کہ آپ نے معجزے بھی دکھائے۔ جذامی اچھے کئے، نابیناؤں کو ہاتھ رکھ کر بنیائی عطا کی۔ گونگوں کو شفا بخشی۔ پانی پر بھی چلے۔ مٹی کے پرندے بنا کر بھی اڑائے۔ مردے بھی زندہ کئے مگر نہ ماننے والوں نے پھر بھی نہ مانا۔ مگر ایک ایسی بھی جماعت تھی جن کو آپ نے عشق کی پاکیزگی اور

محبت کی ادائیں عطا کیں۔ یہ غمگین دل والے لوگ تھے۔ یہ عاجز و مسکین اور خدا ترس تھے۔ زمانے کی بیماریوں کے علاج کا یہی نسخہ تھا۔ عالمِ انسانیّت کو قلب کی منازل سے روشناس کرانے کا یہی طریقہ تھا۔ مگر یہود کے علماء فقہا جو ظاہر داری کی دین کی پابندیوں میں گرفتار تھے اور ریا کاری میں مبتلا تھے انہوں نے فتوے لگانا شروع کر دئے۔ وہ آپ کے طریقِ اسلام پر سخت نکتہ چینی کرنے لگے۔ شرع کی ان ظاہری رسوم کے پابند لوگوں پر یہ باطنی شرع، یہ آئینِ محبت کہاں اثر کرتا۔ اُن سے کچھ بن نہ پڑی تو ایسے فقروں پر آپ کی گرفت کی جن میں محبت کے والہانہ انداز میں محو ہو کر آپ نے اللہ کو اپنا باپ کہا تھا اور آسمانی بادشاہت کا ذکر کیا تھا۔ چنانچہ آپ پر گمراہی، کفر اور بغاوت کا جرُم لگایا گیا۔ افسوس یہ ہے کہ خود آپ کے حواری یا تو چھوڑ کر چلے گئے یا الزام لگانے میں مخالفین کے ساتھ ہو گئے۔ رومی حاکم نے حضرت عیسیٰؑ کو سزائے موت دی۔ رواج کے مطابق صلیب پر چڑھائے گئے۔ قرآن کریم میں ہے نہ وہ قتل ہوئے نہ صلیب پر مرے۔ مرنے کی سی شبیہ بن گئی اور آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ گویا مقامِ رُوح پر نواز لئے گئے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ۶۰۰ سال بعد نورِ کاملین کا ظہور ہوا۔ بنی اسماعیل کے قبیلے بنی ہاشم میں حضور نبی کریمؐ تشریف لائے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوّت عطا ہوئی اور دین کی تکمیل کر دی گئی جس کی دعا حضرت ابراہیمؑ نے مانگی تھی اور جسکی بشارت حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔

ان مقتدر انبیائے کرام کے علاوہ دنیا میں جگہ جگہ ہادی و مرسلین آئے جن کا ذکر الہامی کتابوں میں یوں آتا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں نبی بھیجے۔ متذکرہ بالا انبیاء کے واقعات سے یہ رمز آشکار ہو جائے گا کہ ہر نبی فطری طور پر معصوم تھا، اور اللہ سے ایسے رشتہ میں بندھا تھا جو کسی طرح ٹوٹنے والا نہ تھا۔ القا، الہام، وحی کے ذریعہ حُکم ربّ آنی ان تک پہنچتا رہا اور وہ اسی کے مطابق عالمِ انسانیّت کی رہنمائی کرتے رہے۔ تمام انبیاء کی جدوجہد کو ایک ہی سلسلہ میں دیکھا جائے تو ان میں سے تمام کے تمام مرضئ الٰہی کو پورا کر رہے تھے۔ گو طریقے رنگا رنگ تھے اور حق کے ظہور کی نئی نئی شانیں ان کی زندگیوں میں جلوہ گر تھیں۔ یہ بھی عجب شان

ہے کہ تقاضائے بشریّت سے لے کر عینِ حقیقت تک کی جلوہ افشانی ان کے مُطہر وجودوں سے ہو رہی تھی۔ یہ انبیاء تمام کے تمام بچّوں جیسے معصوم تھے۔ نہ اُن میں خودستائی تھی نہ فریب، نہ بغض تھا، نہ حسد، نہ کینہ نہ غرور، نہ وہ ظالم تھے نہ بھٹکے ہوئے۔ ان کی لَو ہر دم محبوبِ حقیقی سے لگی تھی۔ اسی لئے وہ میزانِ انسانیّت میں، احسنِ تقویم کی تصویر بن کر مختلف ماحولوں میں زندگیاں گزارتے رہے۔ ہماری سطحی نظر اور کمزور عقل کی روشنی میں جو بھول چوک یا کمی بیشی ان میں نظر آتی ہے وہ ہماری ہی کوتاہ بینی کی وجہ سے ہے وگرنہ ان سب میں وہی لطافت، وہی صداقت، وہی توحیدِ ذاتی تھی، جو ایک معصوم میں ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ انہیں اللہ تعالے نے مخصوص صفات سے نوازا تھا۔ تکلیف اور راحت دونوں میں ان کا رشتہ ذاتِ حق سے مضبوطی سے بندھا تھا۔ تب ہی تو نہ کسی رنگ، نہ کسی ماحول کا ان پر اثر ہو سکا۔ نہ ان کی نظر کسی حال میں اللہ سے ہٹ سکی۔ فطرت کی ایک ازلی معصومیّت ان کے اندر تھی۔ اسی لئے یہ کہنا درست ہے کہ انسان سب کچھ بن سکتا ہے، سوائے نبی کے، نبی، اللہ خود بناتا ہے۔ نبی کے بننے کا ماحول سے بھی تعلّق نہیں، بلکہ منشائے ایزدی اور ازل سے اس کا تعلق ہے۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہے کہ جس طرح خلائے کائنات میں مادّی ذرّات کی نمود ہوتی ہے اور صدیوں کاوش کے بعد یہ متحرک ذرّات قریب سے قریب تر آ کر ستارے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح نمودِ کُن کو ارتقاء کی طویل کڑیوں سے گزرنے کے بعد بالآخر ایک قائم بالذات ہستی میں قیام ملتا ہے۔

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ میں لیا تو نے طلوعِ آفتاب

مختلف انبیاء اپنے اپنے زمانے کی عالمِ انسانیّت میں کچھ اس سادگی اور تابناکی سے نمودار ہوئے کہ لوگوں کو ان کی ہستی سے مغائرت بھی نہ ہوئی اور باطنِ عالم درخشاں ہوتا چلا گیا۔ اولادِ آدم پر خالقِ اکبر کی یہ کرم فرمائی ہوئی کہ ان ہی میں سے ان ہی جیسا ایک شخص اپنی صداقت و دانش کا نمونہ، وقتاً فوقتاً زمانہ کے آگے پیش کرتا رہا کہ ان سنگ میلوں کو دیکھ کر اور

ان کو پا کر عالمِ انسانی اپنی راہ پر گامزن ہوتی رہی۔ ان انبیائے کرام کا طریقۂ کار کچھ ایسی یکتائیتِ محبتِ انسانی میں تھا کہ بغیر کسی احساسِ کمتری کے ایک منتخب طبقۂ انسانیّت ان سے فیض پاتا رہا۔ یہ انبیائے عُظام، علم الاسماء کے مصداق، سادوں میں سادہ، غریبوں میں غریب، دانشوروں میں دانشور، فقیروں میں فقیر تھے اور بادشاہوں میں بادشاہ تھے یہ عالمِ انسانیّت کیلئے ایک لائحہ عمل کا نمونہ بن کر پیش ہوتے رہے۔ اور سب سے عجب بات یہ کہ اس میں ان کی مرضی کو کوئی دخل نہ تھا وہ عین مرضیِ الٰہی بن کر خلقت کے سامنے آئے۔ ان کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ عالمِ انسانیّت کی فطری معصومیّت اور سادگی کو ابھار کر، رجوع الی اللہ کرا دیں۔ تا کہ انسان خود کہہ سکے کہ۔

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب ، میرا سجود بھی حجاب

الغرض یہ مرضیِ الٰہی کے اجراء کے نئے نئے نمونے **کُلَّ یومٍ ھُوَ فِی شانٍ** کے انوار میں عالمِ انسانیّت میں ظہور پذیر ہوتے رہے۔ اور خود نبوّت کا ارتقائے باطن ان ہی مطہر وجودوں میں بہ حُکم ربّی بہ اندازِ کُن ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ختمی مرتبت حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰؐ کی ذات میں اس نبوت کی تکمیل ہوئی۔ نبوّت کو ایک قیام عطا ہوا۔ ظہورِ آفتاب ہوا۔ کہ اس ہی کی تجلّی سے تو تاریک رات میں ستارے اور چاند روشن تھے۔ ستارے اس تجلّی کے آگے ماند ہو گئے۔ اب پیکرِ باطنِ نبوّت کو کلی جمعیّت ظاہر و باطن نصیب ہوئی۔ اتمامِ نبوّت، تمامِ دین و نعمت ہوا۔ نزولِ رحمت ہوا۔ اور اس رنگ میں کہ:

لوح بھی تو ، قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گُنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حُباب

یہ رحمت، فضل و برکت سے اُوپر کی چیز تھی۔ یہ وہ شان تھی کہ انسانِ کامل خود رحمتِ عالم بن کر کائناتِ عالم میں پیش ہوا۔ یہ ادا اس کی اُمّت میں بھی ایسی سمائی کہ رحمت بن کر زمانہ پر چھا گئی۔ اس کے بعد سے پیرویانِ دین کی زندگی خود ایک ترتیب ایک جمعیّت کا ظہور تھی۔ یہ وہی یک رخی والی بات تھی جس کا اظہار کائناتِ عالم کا ذرّہ ذرّہ کر رہا تھا۔ نگاہِ بصیرت دیکھتی

ہے کہ کائنات بے رُخ نہیں جا رہی۔ ہر شے قادرِ مطلق کے منشاء اور امرِ ربّانی کا اظہار کر رہی ہے۔ ہر شے ایک فطری سکون، ایک سادگی، ایک رحمت کا اظہار کر رہی ہے۔ قدرت میں انتشار کا جو ذہنِ انسانی یا اعمالِ انسانی میں ہے کوئی بھی اثر نہیں پڑتا۔ پوری کائنات خواستہ یا ناخواستہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کی تسبیح میں ہے اور اس کی طرف رُخ کئے ہے۔ لہٰذا جب بھی انسان نے اپنا منہ اللہ کی جانب موڑا اور صراطِ مستقیم پر قدم رکھا، فلاح پائی اور جب بھی اپنی میزان کھو کر اس راہ سے بھٹکا، اپنا ہی نقصان کیا، جس نے اس میزانِ حیات کو پا لیا اُسے توحید و یک رخی و حیاتِ ابدی حاصل ہوئی اور جس نے توحید ظاہر و باطن سے ہٹ کر اپنی تسلی، اپنی تسکین، اپنی توجہ، اپنی آرزو، اپنا بھروسہ، اپنا ایمان، فانی چیزوں یا فانی اقدار میں ڈھونڈا وہی بُت پرست کہلایا، وہی نافرمان بنا، اور وہی خسارہ میں رہا۔ بات یہ ہے کہ شعور کی دنیا جسے ہم مادّی دنیا کہہ سکتے ہیں، اس کا حال یہ ہے کہ اگر اس کو اپنے ظاہر پر چھوڑ دیا جائے تو ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، جیسے کہ..... عمارت کہ اگر بغیر مرمت کے اسکو چھوڑ دیا جائے تو ٹوٹنے پھوٹنے لگتی ہے۔ مگر وہ چیز جو مادّی طاقتوں کو جن کو ہمارا شعور حاصل نہیں کر سکتا۔ ترقی دیکر انجام تک پہنچا دیتی ہے، رحمت ہے۔ اسی رحمتِ خداوندی کے سہارے انبیاء و صالحین ہی کو نہیں بلکہ کاروبارِ جہان کو فروغ و دائمیت حاصل ہوتی ہے۔ ان انبیائے سابق کے ذکر سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ فطرتِ انسانی میں یہ بات ودیعت تھی کہ مادّی صورتِ انسانی میں حق سے اس کی طرف ہدایت آئے۔ بغیر اس سہارے کے قوموں کا اسلام کی میزان پر قائم رہنا دشوار تھا۔ انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کے شعور کے مطابق ان کی اصلاح فرمائی۔ اور مخصوص جماعت کی باطنی اصلاح کر کے ان کو اس میزان پر لا کھڑا کیا کہ دوسرے عالمِ انسانی کے لئے مشعلِ ہدایت بنیں۔ حق کی طرف رجوع کے لئے ضروری تھا کہ تفکّر کا وہ طریقہ براہیمی ابھارا جائے جو بنیادِ دین ہے اور شرع و پابندئ قوانین کا آئین جو حضرت موسیٰؑ نے پیش کیا اور برکت و محبت کا وہ جمال جو حضرت عیسیٰؑ کا تھا، پھر کہیں عالمِ انسانیّت اُس انوارِ رحمت پر آ سکتی تھی جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے نصیب ہوا۔ یہ تھا اسلام قولِ فیصل کا انداز۔ یہ دعا اور برکت سے اُوپر کی بات تھی یہ خود رحمتِ عالم ہو جانا تھا۔

باب۳

ابراہیمیؑ اِسلام

حضرت ابراہیم کوکلّی حقیقت کی تلاش بچپن ہی سے تھی۔ ماں کے ساتھ غار میں زندگی گزر رہی تھی۔ باہر کی دنیا ابھی نگاہ سے اوجھل تھی، اسلئے نظر ابھی اچھوتی تھی۔فطری تجسّس کے تحت ماں سے دریافت کرتے رہتے اور جو جواب ملتا اس پر دیر تک بیٹھے سوچتے۔ والد نے جب بارہ سال کی عمر میں پہلی بار غار سے باہر نکالا تو شام کے مناظر اور پھیلے ہوئے آسمان و زمین کو دیکھ کر کھو سے گئے۔ یہ کس کے ہیں؟ انہیں کس نے بنایا؟ حقیقت کی تلاش،حقیقت بینی ہی پہلا قدم ہے۔ جوفطرت کے مطابق انسان اٹھاتا ہے۔ یہی جانِ اسلام ہے اور اس کیفیت سے ہر انسان دوچار ہوتا ہے۔ اگر اس تجسّس اور حقیقت بینی میں گہرائی ہے تو قدرت کے راز منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اور اگر یہی نظر پاکیزگی دنیا کے ایک عجائب سے ہٹ کر دوسری، تیسری اور لامتناہی طرف پڑتی رہے تو یہی فطری انہماک اور شوق ایک اچٹتا ہوا سا رنگ لے کر ختم ہو جاتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے پہاڑ کی عظمت پر غور کیا، سامنے سے آتے ہوئے کسان اور بیل کو دیکھا۔ اور یہی سوال اپنے آپ سے کرکے اپنے میں گم ہو گئے۔ یہ کیا ہیں؟ یہ کس کے ہیں۔ ان کو کس نے پیدا کیا۔ ان کا معبود، رب ضرور ہوگا! غار کی زندگی میں اپنی ماں سے جن معبودوں کی بابت سنی رکھا تھا۔ اب اپنے باپ کو ان کی لکڑی کی مورتیاں بناتے دیکھا تو حیرت ہوئی کہ یہ چیز جس کو اپنے ہاتھوں سے ابھی ان کے باپ نے ان کی آنکھوں کے آگے تراشا ہے کس طرح اپنے ماں باپ کا، ان کا اور دوسرے انسانوں کا بنانے والا اور پالنے والا ہوسکتا ہے! چنانچہ سوچنے لگے کہ آخر جن معبودوں کی یہ عبادت کرتے ہیں وہ ہیں کہاں!؟ رب کون ہے۔معبود کون ہے؟ اسی تجسّس اور فکر نے شدّت اختیار کی۔ رات کو نیند نہ آئی۔ آسمان پر مشتری ستارہ چمکتا ہوا دیکھا۔ سوچا یہی پروردگار ہوگا! مگر وہ غروب ہو گیا

مغموم اور مایوس ہوئے۔ فرمایا۔ یہ میرا رب نہیں۔ میں چھپ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ''حقیقت کے طالب کو جب تک انفس و آفاق سے کسی چیز کی تائید نہ ملے وہ اسے کہاں مان سکتا ہے۔ ورنہ ذہنِ انسانی میں جو حاصل شدہ علم کی نسلی یادداشتیں لاشعور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان ہی کے مطابق اس کی عقل کا جبلّی تفکّر ہے۔ اور وہ اسی کو حقیقت سمجھتا ہے۔ جب تک آفاق سے اس کی تائید نہ ملے وہ اپنے ہی توہّمات ہیں۔ اب حضرت ابراہیم کے طریقۂ فکر پر غور کریں۔ میں چھپ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا، چاند نکلا۔ آپ نے سمجھا کہ یہی رب ہے مگر وہ بھی کچھ گھنٹوں بعد اوجھل ہو گیا۔ اس دفعہ فرمایا ''اگر میرے رب نے مجھے راہ نہ دکھائی تو میں بھی ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو اس کی راہ سے بھٹک گئے'' صوفیاً کا کہنا ہے کہ تارا نورِ نفس ہے۔ عقل، نفس و جسم اور مادّی یا عقلی سہاروں کو متلاشیٔ حق اپنا پالنے والا اور اپنا بھروسہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ ان کو بھی قیام کہاں۔ چاند، نورِ قلب ہے۔ عشق کو ہی انسان اپنا سہارا، اپنا رہنما سمجھنے لگتا ہے۔ مگر حقیقت تک رسائی آگے کی منزل ہے، جو بہ تائیدِ ربّی ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اپنے تزکیۂ نفس، اپنی جلائے قلب سے بھی کام نہیں بنتا۔ اسی لئے فرمایا ''اگر میرے رب نے راہ نہ دکھائی تو میں بھی راہ بھٹکنے والوں میں ہو جاؤں گا'' اس کے بعد دن ہوا۔ سورج نکلا۔ خوشی سے چلّا اٹھے یہ میرا رب ہے۔ یہ بہت ہی بڑا اور روشن ہے۔ اب تو پریشان ہوئے اور سوچ میں پڑ گئے بالآخر وہ بھی غروب ہوا۔ اس پر بہت ناامیدّی ہوئی۔ اس لئے کہ سونے والے یا چھپ جانے والے خدا کو وہ کیسے مانتے۔ اب آپ کو اپنے بڑوں پر بھی غصہ آیا کہ یہ لوگ ایسی چیزوں کو کیا خدا مانتے ہیں جو قائم نہ رہ سکیں، چھپ جائیں اور غروب ہو جائیں۔ ایسی چیزوں کو ایسے توہّمات کو اپنا خدا ٹھہرا لینا گویا اصل خدا کی خدائی میں دوسروں کو شامل کرنا تھا۔ اسی لئے اس بار والد کی قوم سے فرمایا ''تم لوگ جو شرک کرتے ہو میں اس سے بیزار ہوں'' سورج نورِ روح ہے۔ قلب کے مقام سے بلند ہو کر مقامِ روح حاصل ہو تو گویا اسی کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی لئے آپ نے اس کو گمراہی یا راہ بھٹکنا نہیں کہا بلکہ اس کو شرک قرار دیا۔ یہ اسی کے تحت تھا جسے فطری فراستِ مومن کہا جا سکتا ہے۔ اس کا ریاضت سے بھی تعلق نہیں بلکہ یہ ایک فطری، باطنی سکون میں ہونے والی بات ہے۔ جن روحوں کو توحیدِ ذاتی حاصل

ہوتی ہے ان کا رابطہ براہِ راست عقلِ کُل سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فطرتِ معصوم یہی ہے، رحمت کی کارفرمائی یہاں اسی صورت میں ہے۔ یہ باطنی نظر پیدا ہونے کی بات ہے۔ اس حالت میں ذہن اور عقل کا رابطہ ادھر سے ہوتا ہے جسے حقیقت کہہ لیں۔ اس قسم کے خیالات کا ذہن یا زندگی سے رابطہ اس طور پر ہوتا ہے جیسے روح کا روحِ اعظم سے۔ مجرّد ات کی فہم بھی اسی سطح کی بات ہے۔ جسے فکر وغور کا یہ اچھوتا پن نصیب ہو وہ نہ عقل کی گمراہی میں پڑ سکتا ہے نہ معاشرہ کی تہم پرستی میں۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ اتنی کم عمری میں اپنے والد سے معصومیت میں کہتے ہیں۔ ''ابّا جان آپ اس کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ دیکھے، نہ سنے، نہ آپ کے کام آ سکے؟۔'' حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان ایسے خدا کی کیوں عبادت کریں۔ جو نہ دیکھے، نہ سنے، نہ کام آ سکے۔ عقائد کی بے ڈھنگ روش اور رسم و رواج کی اندھی تقلید میں عالمِ انسانیت اندھی عبادت میں لگی رہتی ہے۔ نہ اسے خدا کی تلاش ہوتی ہے۔ نہ تجسّس، نہ اُسے یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا سے رابطہ قائم ہو۔ کتنا معصومانہ اندازِ فکر تھا حضرت ابراہیمؑ کا اور ادھر باپ غُصہ میں آپے سے باہر ہو گیا کہ یہ کیسا لڑکا پیدا ہوا جو مذہب کے خلاف ہے۔ یہی کچھ انسانیت کے ہر دور میں رہا ہے کہ جن کو بھی معراجِ تجسّس وفکر حاصل ہوئی اور خلوص و وفا سے انہوں نے اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہا ان کو اندھے مُقلّدوں نے بُرا کہا۔ گمراہ قرار دیا اور ستایا۔ جب حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور لوگوں کی ہٹ دھرمی دیکھی تو تنہائی اختیار کی۔ غور وفکر اور انہماک کے ساتھ ایک ہی دھن میں مستغرق ہو کر پہاڑ پر جا بیٹھے۔ یہ فکر عقل کی سطح کی نہ تھی بلکہ ایک تڑپ، ایک شدّتِ شوق لئے تھی۔ ایک دن اسی شدّتِ استغراق میں اپنے زانوؤں میں سر ڈالے بیٹھے تھے کہ یکا یک اٹھے اور تیزی سے یہ کہتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اترے ''میں نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یقیناً میرا رب جو بزرگ و برتر ہے۔ آنکھوں میں سمانے والا نہیں۔ بے شک میرا رب بہت بڑا ہے وہ ہر چیز پر حاوی، ہر چیز سے باخبر اور ہر بات پر قادر و توانا ہے۔'' یہ خود آگہی کی جھلک تھی۔ یہ خود بخود ہوتی ہے، اپنے آپ میں ہوتی ہے۔ اور اپنے آپ تک یہ آگہی اس علم سے علیحدہ چیز ہے جسے آگاہی کہتے ہیں آگاہی کا تعلق صفات سے ہے اور اس کے لئے مادّی ضرورت ہے۔ یہ ذہن و عقل

تک کی چیز ہے۔ آ گہی اپنے اندر کی چیز ہے۔ اس کا رابطہ حقیقت سے ہے۔ یہاں رحمت کار فرما ہوتی ہے اور اسی لئے ایمان بالغیب اللہ کے خصوصی کرم سے ہی نصیب ہوتا ہے۔ تمام انسانوں کے لئے یہ کسی کی نظرِ کرم سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنی عقل، اپنی کاوش کی رسائی یہاں تک نہیں۔ عام انسان تو خود اپنے وجودی تعیّن کی وجہ سے اپنے مرکز تخیل، مرکز محبّت اور حقیقت تک کا ایک تعیّن وجودی مانگتا ہے۔ اسی کو بت کہہ لیں۔ جیسے ربو بیت کے بت۔ محبّت کے بت وغیرہ۔ یہ ضرور ہے کہ عوام میں سے کچھ حق رسیدہ لوگ اپنی فہم و دانش کا رابطہ عقلِ کل سے قائم کر لیتے ہیں اور اپنے تعیّنات کی بندشوں سے آزادی حاصل کر کے مجرّ دات تک رسائی کر لیتے ہیں۔ اس طرح انہیں حق کی مختلف قوّتوں کی تجرید کا ادراک ہو جاتا ہے۔ جیسے ربو بیت، برکت، رحمت، حُسن، عشق وغیرہ مگر عوام کو بغیر کسی مادّی نشانی کے ان کی فہم یا احساس دلانا ناممکن تھا۔ اس لئے انسان کی سہل پرستی نے ہر ایسے مجرّ دات اور طاقتوں کے لئے بت مقرر کر لئے جن کی طرف عوام کو رجوع کرنا مقصود تھا۔ یا پھر عظیم انسانوں کی عظمت کے اظہار کے لئے ان کے بت بنا ڈالے کہ آنے والی قوموں کو ان کی یاد رہے مگر رفتہ رفتہ ان بتوں کی پرستش ہی شروع ہونے لگی۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ تک عالمِ انسانی کے مخصوص افراد کو قدرت کی مختلف قوّتوں کا علم ہو چکا تھا۔ یعنی مجرّ دات کے تعیّنات کا فی حد تک معلوم ہو چکے تھے اور ان کا نفاذ ہو چکا تھا۔ مگر عام انسانوں کے لئے ان کی فہم صرف بتوں کی حد تک ہی محدود تھی۔ اللہ پاک نے حضرت ابراہیمؑ کی روح کو بچپن ہی سے وہ بالیدگی بخشی تھی اور وہ فروغ عطا کیا تھا کہ ان کو سارے تعیّنات کو، مع خود اپنے تعیّن کے، پاش پاش کر کے حقیقت تک پہنچنے کی تڑپ ہوئی۔ چنانچہ ہر اس چیز کو جس میں روشنی تھی اور اپنے سے دور اور پہنچ سے بالاتر تھی۔ یکے بعد دیگرے اپنا خالق مانا جیسے تارا، چاند، سورج۔ مگر یکے بعد دیگرے انکے شوقِ تجسّس نے، انکی روح کی بالیدگی کی وجہ سے یہ رمز کھولا کہ یہ بھی تعیّنات میں ہیں اور حقیقت سے بہت دور ہیں۔ اور جب پردہ اٹھا تو اپنا رابطہ حقیقت سے پایا۔ بالفاظِ دیگر جیسا کہ ہوتا آیا ہے وہ اپنے باطنی نور کے مدارج کو اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہے، اور خارج کرتے رہے، یہاں تک کہ بالآخر

حقیقت سے خود آ گاہ ہوئے۔ خود آ گہی نصیب ہوئی۔ حضرت اویسؓ قرنی حضورؐ نبی کریمؐ کے عاشق تھے۔ آپ نے نہ حضورِ اکرمؐ کی صورت دیکھی، نہ آواز سنی۔ پھر کیسے عاشق تھے! یہ بصیرتِ روح کی بات ہے یہ نُوْرُ السَّمٰوٰات کی بات ہے۔ وہ نور جو سب کائنات پر حاوی و ساری ہے۔ اپنے اندر بھی تو اسی کی تجلّی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اللہ کے نبی تھے۔ ان کی حقیقتِ نبوت جاری و ساری ہے۔ اس سے رابطہ فکرِ ابراہیمیؑ، خلعتِ براہیمی کے ذریعہ ہی قائم ہوسکتا ہے۔ اسلام کی پہلی منزل، منزل براہیمی تجسّس کا یہ انداز موجودہ زمانۂ مادّیت میں مغرب میں نظر آ رہا ہے کہ ہر قسم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ خدا کی تلاش، ایک مالکِ کائنات کی تلاش نے یہ شدت اختیار کی ہے کہ کثیر تعداد میں نوجوان طبقہ اپنی تہذیب کی بندشوں کو اپنے لئے ایک بوجھ سا سمجھ کر، اپنی زندگیوں میں سادگی اختیار کر کے مشرقی ممالک میں گھوم رہا ہے۔ اسی طرح سائنسی دنیا کی ترقی اور اس سے حیرت انگیز کمالات، اسی تجسّس یعنی حقیقت براہیمی کی ادنیٰ سی جھلک ہے۔ یہ سائنسدان اپنے تجسّس اور انہماک و توجہ کی شدّت میں کسی مجذوب فقیر سے کم نہیں ہوتے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کی غیرت ان کو نوازتی ہے صرف فرق اتنا ہے کہ یہ وہی براہیمی دور والی بات ہے کہ جب کسی سنتِ الٰہی کا انکشاف ہوا۔ مجرّدات تک انسان کی رسائی ہوئی تو اس کو تعیّن میں لا کر تسخیرِ فطرت میں لگ گئے۔ مادّی رنگ اختیار کرنے لگے، روح کے اس فطری تجسّس کو دنیا کی طرف موڑ دیا اور حق کی طرف سے آنکھیں موڑ لیں۔ صرف سنتِ الٰہی اور قوانینِ فطرت کو ہی منتہا مان کر وہیں ختم ہو گئے اور ان قوانین کے بنانے والے کی الوہیت کی طرف رجوع ضرور ہوئے مگر حقیقت سے بے بہرہ ہی رہے۔

حضرت ابراہیمؑ خالقِ حقیقی کے نور کو اسی کے فضل و کرم سے اپنائے ہوئے تھے، البتہ ان کا ایقان زینہ بزینہ مستحکم ہوتا گیا۔ جب نمودِ حقیقت ہوئی تو گویا دل میں سمایا۔ آنکھوں میں سمانا تو گویا اس ذات کو حدودِ اربعہ میں محدود کرنا تھا۔ جب دل میں سما گیا تو دل کی حدود بے حد و بے پایان۔ اب نہ جسم کی قید و بند میں گرفتار، نہ زمان و مکان کی پابندی۔ یہ وَسِعَ

کُرْسِیُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض والی بات تھی۔ اس طرح جب اپنایا تو خود بھی لامحدود سے رابطہ قائم ہوا۔ پھیلتے پھیلتے کائناتِ عالم سے ہی نہیں بلکہ حقیقتِ ذات سے توحیدِ ذاتی نصیب ہوئی۔ توحید کا یہ خالص رنگ جس میں ذات کے علاوہ کوئی دوسرا تخیّل نہ ہو براہیمی انداز ہے۔ جب یہ نصیب ہوا تو فرماتے ہیں۔ ''میں نے یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کر لیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔'' یہی الفاظ مومنین کی ہر نماز سے پہلے نیت کے لئے مقرر ہوئے۔ یہ وہ یک رخی ہے کہ کائناتِ عالم میں سوائے ذاتِ باری کے دوسرا تخیّل یہاں تک کہ اپنی ''مَیں'' کا تخیّل شرک ہوا۔ میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ میں اپنے وجود تک کو ذات سے علیحدہ تصوّر کر کے یا اپنی مختاری جتا کر اسکی مختاری میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ اس ذاتِ بے ہمتا کے علاوہ کائنات میں کوئی دوسری حقیقت نہیں۔ اس یکتائیتِ توحید میں نمودِ حقیقت ہونا، اپنے باطن کا جاگنا ہے۔ فروغِ کنہ ہے اور کچھ اس یکتائیتِ توحید میں کہ جیسے حق اپنے کو لپیٹے ہو، حق اپنے اندر بھرا ہو، یہاں تک کہ سوائے حق کے اپنا کچھ نہ رہے۔ جب اندر باہر ایک ہی توحیدِ ذات میں ہو گئے۔ تو جیسے کائنات اپنے میں سمولی، کائنات سے ہم آہنگ ہوئے۔ انفس و آفاق میں تائید ملی تو اب تیقن پیدا ہوا کہ حقیقت کو نہ صرف پا لیا بلکہ اپنا لیا۔ اب زمان و مکان کی قید نہ رہی۔ عقلاً نہیں، کیوں کہ عقل کی رسائی تو بس شعور اور حواس خمسہ تک محدود ہے۔ یہ واردات تو کشف و عرفان سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں اپنے کو بھی شعور نہیں ہوتا۔ البتہ یقین میں وہ پختگی آ جاتی ہے کہ اب کوئی چیز اس کو نہیں توڑ سکتی۔ نہ عقلی دلائل، نہ ارضی و سماوی ابتلائیں یا آزمائشیں۔ یہ اس لئے کہ عرفان یا علم لدنی، حقیقت سے ہم آہنگی کی کیفیت میں عطا ہوتا ہے۔ اس کا نہ ظواہر سے تعلق ہے نہ عقل سے، نہ اپنی کوشش سے۔ جب تفکرِ عمیق سے عقل و حواسِ ظاہر کا اثر زائل ہوا۔ تعیّنات کے پردے ہٹے تو اپنے اندر جو حقیقت ہے وہ آشکار ہوئی۔ جسے یہ نصیب ہوا اس کی دنیا بدل گئی۔ وہ دنیا میں ہوتے ہوئے بھی دنیا کا نہیں۔ وہ مادّی پابندی میں ہوتے ہوئے بھی اس سے بالاتر ہے۔ اب اس کے ظاہر کے پردے ہٹ کر لا الٰہ ہو کر اس کے اندر کا چراغ روشنی دینے لگا۔ الم نشرح ہوا اس چراغ کی بتی اب الحیات کے تیل سے روشن ہے۔ اب اسی میں سے حق

کی حقیقتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔ نشرِ حق ہو رہا ہے۔ اب وہ ابراہیمی اسلام میں داخل ہوا۔

الغرض جب نمودِ حقیقت ہو چکی تو اس روشنی کو باہر پھیلانے کیلئے حُکمِ ربانی ہوا کہ اپنے باپ کے گھر سے نکل اور کنعان چلا جا۔ میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور جو تجھے برکت دیتے ہیں انہیں برکت دوں گا۔ دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔ چنانچہ مسلمان پر نماز میں اتحیات میں اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی اِبْرَاھِیْم ... پڑھنا لازم ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ پہلا اُمتحان تھا کہ اللہ کے حکم پر وطن اور خاندان ترک کیا۔ اس کے بعد آپ نے قلندری طریق اختیار کیا۔ ایک جگہ قیام کرنے کو ہیچ سمجھا، وطن در وطن گھومتے پھرے۔ ان حقیقتوں کی جو خود اپنے اندر تھیں، جہان کی وسعتوں میں تائید ملی۔ کائناتِ عالم میں انسان اپنا ہی حُسن دیکھتا ہے۔ اس سکونِ قلب کی کیفیت میں فطرت اور ماحول سے مکمل سازگاری نصیب ہوتی ہے۔ برہمنیت کی چھ ہزار سال کی بقا کا راز بھی یہی ابراہیمی انداز ہے کہ فطرت اور ماحول سے سازگار ہو کر، سکونِ قلب حاصل کئے بیٹھے ہوئے ہیں، یا دیس دیس گھوم کر اپنی تلاشِ حقیقت کی تڑپ بجھاتے رہتے ہیں کہ ہر قدم حق کی تلاش ہی میں تو اٹھ رہا ہوتا ہے۔ یہی وہ ابراہیمی تصرّفات ہیں جن کو برہمنوں نے اپنا رکھا ہے۔ ان کا براہما بھی حضرت ابراہیمؑ ہو سکتے ہیں۔ سنا ہے ہمالیہ میں صرف ایک مندر ہے براہما کا۔ اس میں مخصوص لوگ ہی جا سکتے ہیں۔ براہما کی کوئی پوجا نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ نے تو بتوں کے تعیّنات سے انسان کو آزاد کرا کے مجرّدات کی جانب رخ موڑ دیا تھا پھر ان کی پوجا کیسے جائز ہوتی۔ اس براہما بت کا کشتری برہمن ہے۔ ہاتھ کشتری۔ پیٹ ویش اور پیر شودر جو ہندوؤں کی چار ذاتیں ہیں۔ اسلام نے حضرت ابراہیمؑ کے طریق کو اپنایا ہے جیسا کہ نماز کی نیت اور اتحیات سے ظاہر ہے۔ ویسے تو اسلام حضرت آدمؑ سے چلا مگر بہ حیثیت ایک نظام اور ایک لائحہ عمل کے حضرت ابراہیمؑ ہی سے شروع ہوا۔ اس براہیمی نسبت میں لطف یہ ہے کہ ظاہر و باطن دونوں ہی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ انسان کا یہ تجسّس یہ رجحان و انہماک دراصل اپنے باطن کی تڑپ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مگر روزمرّہ کی زندگی کے ہنگاموں میں یہ رجوع صرف ظاہر کی حد تک ہی رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بُت شکنی ہی کو لیں، یہ اپنی راہ سے

رکاوٹوں کا ہٹانا ہے۔ ہر توہم باطل کے نقش مٹانا ہے۔ ہر خواہشِ نفسانی کے بندھنوں سے اپنے کو آزاد کرانا ہے۔ ہر دنیوی اقتدارِ باطل کو ہٹانا ہے۔ المختصر ہر ماسوا کی لا کرنا ہے، نہ کہ صرف پتھر کے بُت توڑ دینا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ بہ ظاہر آزر کے بت توڑتے تھے۔ مگر حقیقت میں انہوں نے اپنے علم وفہم کے بُت، توہّمات واعتبارات کے بُت خواہشات کے بُت حتیٰ کہ سب سے بڑا بُت اپنے نفس کا بُت بھی ختم کیا۔ تب کہیں آپ پر کلمۂ لاالٰہ اِلّااللّٰہ کی تجلی آئی۔ حقیقت کا یہ انکشاف، انسانیت کے لئے ایک احسان کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس جگہ یہ ضرور ملحوظِ خاطر رہے کہ کلمۂ لاالٰہ اِلّااللّٰہ آدھا کلمہ ہے یا یوں کہیں کہ سکّہ کی ایک سمت ہے اور محمد رسول اللہ جس سے انبساط کی ایک لہر آ جاتی ہے۔ ابھی خفا میں تھا۔ حضور نبی کریمؐ کے آنے سے پہلے یہ حقیقت خفی واخفا میں رہی۔ مگر اس آدھے کلمے تک پہنچنے کے لئے بھی اسی نورِ محمدیؐ کی برکت تھی کہ عالمِ انسانیت کو اس تجسّس اور تڑپ کا پھل ملتا رہا ورنہ یہ کوئی ضروری بات نہ تھی کہ ہر کوشش، ہر کسی کو اس کے اپنے تعیّن کئے ہوئے انجام تک پہنچائے۔ اسی کو بہ الفاظِ دیگر قسمت کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے تمام اندازِ فکر وعمل کو باطنی نظر سے دیکھیں تو وہ رمز آشکار ہوں جو عالمِ باطن میں دوسری اہمیت رکھتے ہیں۔ یہیں تو حقیقت کی تلاش کی تڑپ ہے، یہیں تو عشق کی کلی کھِلتی ہے۔ یہیں تو ارتقائے باطن ہوتا ہے۔ پھر روح کے مقامات سر، خفی، اخفا سے لے کر غیب اور ذات تک رسائی ہوتی ہے۔ اپنا خاندان چھوڑ کر صحرا نوردی، باطنی کی سطح پر نفس کی واردات ہے۔ اپنے نفس کی طلب کے خاندان، عقل، حواسِ خمسہ، جبلتیں، ظواہر عالم سے بلند ہو کر ان کی حقیقت کی تلاش، نمودِ باطن کا فطری جذبہ ہے، تزکیۂ نفس ہے، تجسّس وفکر عشق کی تڑپ ہے۔ نارِ نمرود باطن کی سطح پر قلب کی واردات ہے، نارِ عشق کا گلِ عشق میں تبدیل ہونا ہے، حقیقت کے گلزار تک رسائی ہو جانا ہے۔ وہ خلشِ عشق، وہ تڑپ، وہ جلن نہ صرف یہ کہ ٹھنڈی ہو کر ختم ہو جائیں کہ یہ تو مُردہ کیفیات ہیں بلکہ کُن کے تقاضوں، ربوبیت و پرورش کے بموجب ان میں اب نمودِ حُسن اور فروغ ہونا ہے۔ تاکہ یہی سکنیت دامن کا باعث ہو۔ حیاتِ عشق اب محبوبیت کا رنگ لئے ہوتی ہے اور اس مقام پر طالب ومطلوب کے درمیان

جبرائیل کا سہارا بھی قبول نہیں ہوتا۔

وہ چار پرندوں کا کاٹنا روحِ مردہ کی بالیدگی اور اس کی ارتقائی منازل پر اطمینانِ قلب کر لینا ہے۔ یہ چاروں جانور ارتقائے باطن کے مختلف مدارج کا اظہار ہیں۔ مرُغ نفس ہے۔ کوّا لطیفۂ نفس، مور قلب، اور کبوتر روح، واقعہ مشہور ہے کہ بہ حکمِ ربّی حضرت ابراہیمؑ نے ان چاروں جانوروں کے سر کاٹ کر ایک پہاڑ پر رکھے۔ پر ایک پہاڑ پر، دھڑ ایک پہاڑ، اور پیر ایک پہاڑ پر۔ پھر ان کو پکارا تو سب بھاگتے ہوئے ان تک پہنچے۔ حضرت ابراہیمؑ تو نبی تھے۔ وہ خالقِ حقیقی کے نور کو اس کے فضل و کرم سے اپنائے ہوئے تھے۔ آپ کو ایمان تو تھا ہی ایقان اس طرح مضبوط ہو رہا تھا۔

وہ بے برگ و گیاہ میدان میں بیوی بچے چھوڑنا میدانِ روح میں قدم رکھنا ہے۔ ظواہر سے قطع تعلق کے بعد۔ یہ منازلِ حقیقت اب توکل برالله طے کرنی ہیں۔ اب طریقت کے بادبان پر بحرِ حقیقت میں سفر ہے۔

ذبحِ اسماعیل، طفلِ روح کی قربانی کے بعد روحِ اعظم سے رابطہ ہے۔ اسکے بعد ہر سہارے کو قربان کرنا ہے، یہاں تک کہ اس توکل تک کو۔ یہ ترکِ صفات کا مقام ہے۔ ترکِ ترک کا مقام ہے۔

تعمیر کعبہ، تعیّن ذات کی نشانی ہے۔ جب سب آلائشیں ختم کر دی جائیں۔ ترکِ نفس، ترک قلب، ترک روح تب کہیں ذات کی جھلک ملتی ہے۔ تعیّنِ ذات ہوتا ہے۔ اسکی نشانی کیلئے دل کا حرم ہوتا ہے جس میں سب کائنات سمائی ہوتی ہے، یہ تو باطن میں ہوتا ہے اور ظاہر میں اب خلقت اس کی طرف رجوع ہونا شروع ہوتی ہے۔

اس جگہ یہ موزوں ہوگا کہ کعبہ کی اہمیت بیان کر دی جائے۔ کعبہ کی طرف رخ کرنے سے پہلے بیت القدس کی طرف رجوع تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے ہیکل سلمیانی بنوایا۔ دنیا کے حیوان، چرند، پرند، جن، ظلماتی اور نورانی طاقتیں آپ کے زیر فرمان تھیں۔ جتنے بت تھے ان

کی لگام آ پکے ہاتھ میں تھی۔ حضرت سلیمانؑ سے پہلے کچھ قوموں نے نفس کے تحت ظلماتی طاقتوں کو اپنایا تھا۔ ان سے کام لیتے تھے جیسے عامل اور جادوگر وغیرہ کہا کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو ساری ظلماتی اور نورانی طاقتوں پر تصرّف اس لئے بخشا تھا کہ یہ پرستش کے قابل نہیں تھیں۔ بلکہ تصرّف کے لائق۔ انسان کا مقام ان سب سے بلند تھا۔ حضرت سلیمانؑ کو یہ طاقتیں عطا ہونا نفس کی اطاعت سے بلند ہو کر اس پر حکمرانی کی نشانی تھی۔ بیت المقدس اسی چیز کے تعیّن کی نشانی تھی یعنی تعیّن صفات کی۔ مگر حق آ گہی سے دور کی بات تھی۔ یہ سہرا بھی حضرت ابراہیمؑ کے سر ہے کہ کعبہ کا تعیّن کیا۔ کعبہ تعیّنِ ذات کی نشانی تھی۔ البتہ ذات سے واصل ہو کر خلقتِ خدا کو ذات کی طرف رجوع کرنے کا وقت حضور نبی کریمؐ کے زمانہ میں آیا۔ اب تک کعبہ بت خانے میں تبدیل ہو چکا تھا وہی تعیّنات کے بت، وہی مجردات و صفات کے بت جنہوں نے ذہنِ انسانی میں ذاتِ حق کی جگہ لے رکھی تھی کعبہ میں نصب تھے۔ گویا کعبۂ دل میں حق کی جگہ، اپنی آرزوؤں کے خداؤں نے لے لی تھی۔ یہاں تک کہ سب سے بڑے بت اپنی 'میں' نے۔ یہی شرک قرار پایا۔

جب حضور نبی کریمؐ پر وہ انعامات عطا ہوئے کہ نفس، قلب، روح کی اطاعت سے بلند ہو کر ان پر حکمرانی ملی تو ذات کی طرف رجوع، ہر مسلمان کے لئے مقرر ہوا۔ اب نورِ حق کے آتے ہی باطل رفع ہوا۔ اُدھر کعبہ سے بت اتار دئے گئے، اِدھر مسلمان کے خانۂ دل سے سب جھوٹے بت اتار دئے گئے۔ اب وہاں ایک ہی وحدہٗ لاشریک لہٗ کا چراغ روشن ہوا۔ اسی روشنی کو دیکھ کر تو پروانہ وار طواف ہوتا ہے ورنہ جس کے لئے شمع بجھی ہوئی ہو اس کا طواف کیا۔ سجدہ و قیام کیا۔ سعی و قربانی کیا۔ بیت المقدس کی جانب سے رجوع کعبۂ ذات کی طرف ہوا اور وہ بھی نماز کے دوران، نماز، معراج المومنین۔ جب عروج بہ سوئے ذات ہوا تو حقیقتِ ذات کی نشانی یعنی کعبہ کی طرف رخ پھیرا۔ خلقت نے اپنے اصل رجوع، اپنے کعبۂ مقصود یعنی ذاتِ حق کی طرف کیا۔

باب۴

موسویؑ اسلام

اب موسوی دین کی طرف توجہ کی جائے، خود حضرت موسیٰؑ کی تربیّت پر نظر ڈالیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی ایک عجوبہ ہے، جیسے اللہ چاہے ویسے گزرتی ہے۔ یہ زمانہ ظلم و استبداد، قہر و غصب، جھوٹے جاہ و جلال کی بادشاہی کا تھا۔ انسان پر انسان کی جھوٹی خدائی کا دور تھا۔ نبیوں کی اولاد، آلِ اسرائیل، آج فراعنہ، مصر کی غلامی میں زندگی گزار رہی تھی۔ یہ وہی قوم تھی جو انبیائے سابقین کے زمانوں میں بار بار انعام و کرام سے نوازی گئی مگر ان انعامات پر صابر و شاکر رہنے کی بجائے اور مغرور ہو چکی تھی۔ اپنی نسل، اپنی عقل، اپنی ہنر مندی، اپنے علم و عرفان کے گھمنڈ میں یہ دوسروں کے لئے زحمت بن گئے۔ اور اب حقارت کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے۔ حضرت موسیٰؑ گو شہزادگانِ فرعون میں شمار ہو کر پلے مگر ان کی رگوں میں بھی تو آخر انبیائے بنی اسرائیل کا پاک خون تھا۔ اسی لئے ان کی فطرت ان فراعنہ، اور ظالمین سے مختلف تھی وہ ان حاکموں کا جبر و ظلم دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے اور مظلوم و مجبور قوم کی بہبودی اور بہتری کیلئے بیتاب رہتے جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ جذبہ بھی بڑھتا گیا اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک قبطی کے ہاتھوں ایک بنی اسرائیل کی مار پیٹ برداشت نہ کر سکے۔ آپکا اس قبطی کے مکہ مارنا اسکی موت کا بہانہ بنا۔ ضرب کلیمی کی تاب وہ کہاں لا سکتا تھا! اب اس نو شتۂ تقدیر کہہ لیں یا منشائے ایزدی، کہ اسی جذبۂ ہمدردی کو مزید وسعت دینے کیلئے ان فراعین کے دربار اور اس ماحول کو، بہ ظاہر قانون کی گرفت سے بچنے کیلئے چھوڑنا پڑا۔ نہ یار نہ مددگار نہ ماں باپ، نہ کوئی دوسرا آسرا۔ صحرا و دشت، دریا و پہاڑ، غربت اور سفر۔ مگر یہی سختیاں، اپنی شدّتوں اور باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنیں۔ کنعان پہنچے تو

حضرت شعیبؑ پیغمبرِ وقت کے زیرِ سایہ مزید مشقت و خدمت کے ذریعہ، پختہ سے پائندہ تر بنے۔ باطن میں غوطہ زنی کے مواقع تنہائیوں میں ملے۔ تذکیۂ نفس کیلئے مزید تربّیت و تہذیب حاصل ہوئی۔ جوانی کی حیاء نے پاکدامنی میں پرورش پائی۔ علم و دانش کے مدارج بھی عطاء ہوئے کہ یہ انعام تھا بارگاہِ ایزدی سے آپکے زہد و تقویٰ، پرہیز گاری اور نیکوکاری کا، یہ تقوی صرف اپنے نفس پر قابو پا لینا نہ تھا۔ یہ تقوی، جسم و عقل کی حدود تک کا نہ تھا اس کیلئے ہر خواہش، ہر سہارے، ہر آرام، ہر سکون کو چھوڑنا ہی کافی نہ تھا۔ بلکہ اسکو قائم دائم کرنے کیلئے حیّ و قیوم سے رشتہ استوار کرنا تھا، اس ذوالجلال والاکرم کی جلالت سے نسبت قائم کرنا تھی جو تمام فراعنہ سے کہیں زیادہ پُرعظمت جلال اور دبدبے والا تھا۔ دنیوی اقتدار اور حاکمیت سے ہٹ کر نظر اب احکم الحاکمین پر تھی۔ اپنے مرکزِ طلب کی طرف قلب رجوع تھا۔ تجسّسِ حقیقت اور تڑپ کا انداز یہاں بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح اندر ہی اندر بھڑک رہا تھا۔ اپنے ہی اندر اس ذوالجلال والاکرام کی حقیقتوں کو سمو کر، عالمی مرتبت اور ذوالجلال نبی بنے، اور انعام و کرام سے نوازے گئے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی معیّت میں علم لُدّنی کی تعلیم دی گئی تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ اِس عقل کو بھی اسی اطلاع کے تابع رکھنا ہے جو وحی یا علمِ لُدّنی کی صورت میں حق کی طرف سے انسان کو انعام ملتا ہے۔ اسی کے حصول کے بعد انسان پر یہ واضح ہوتا ہے کہ عقل و دانائی کا منبع خود اس کی عقل کے اندر نہیں بلکہ اس کو بھی اس سے بالاتر اندر والی، لاشعوری قوّتیں سنبھالے ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو باطن کی ان حقانی قوّتوں کی بابت علم دیا گیا اور اس نورِ حقیقت پر عملی دسترس حاصل کرا کے اپنی باطنی قوّتوں کو، ظواہرِ علم کی تسخیر کے لئے استعمال کرنا سکھایا گیا۔ کیونکہ صاحبِ کتاب نبی کیلئے صرف ظاہر کی طاغوتی، مادّی قوّتوں کا سطحی حد تک ہی، عقل و شریعت کے سہارے نبٹ لینا کافی نہ تھا۔ بلکہ اس عظیم المرتبت نبی کو اُس نورِ باطن پر بھروسہ کرنا تھا جو عقل و شریعت کا منبع ہے اور جس کے ذریعہ کائناتِ عالم کو ایک رُخ عطا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی حیات پاک کے واقعات شاہد ہیں کہ اسی نورِ باطن کے ذریعہ آپ نے ان ممنوعات کا مقابلہ کیا جو معاشرہ میں عقلِ ظاہر کے اتباع اور باطل روم میں گرفتار ہونے کی صورت میں عالم انسانیت میں رائج تھے۔

نورِ باطن یا نورِ عقل کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ایک علم، عقل کی سطح سے ہے۔ حواسِ خمسہ کے ذریعہ جو مکاشفات اور تجربات حاصل ہوتے ہیں۔ انکا خزینہ، یادداشت کی صورت میں ذہنِ انسانی میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ ضرورت کے وقت انسان اسی علم سے کام لیتا ہے۔ اسی کو شعور کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر کچھ گہری یاداشتیں نسلاً بعد نسلاً، انسانی نطفہ تک کے اصل میں محفوظ رہ کر کئی پشت تک اسکے لاشعور میں جمع ہوتی ہیں۔ یا کسی فرد کی بچپن سے لیکر بڑھاپے تک کی زندگی میں خصوصی واقعات کے اثرات لاشعور میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان لاشعوری یاداشتوں کے زیر اثر بسا اوقات انسان ایسے عمل کرتا ہے جن کا تعلق ظاہری شعور سے نہیں ہوتا۔ الغرض شعور اور لاشعور دونوں ہی عام انسانی ذہن پر اثر پذیر ہوتے ہیں اور اس کے عمل کو رخ دیتے ہیں۔ مگر شعور و لاشعور سے ماوراء بھی ایسا علم جو بفضلِ ربّی، بہ امرِ باللہ خود بخود اپنے میں سے پھوٹ رہا ہو۔ اسے چھٹی حس کہہ لیتے ہیں۔ اس علم کا تعلق عقل ظاہر سے نہیں ہوتا۔ اسی چھٹی حس کے تحت ذہن انسانی سے دور رس تخیّلات، خود بخود کسی فرد میں عالم انہماک میں، یا یکا یک آنے لگتے ہیں۔ اسی قسم کے خیالات کے نتائج میں ایسے بہت سے واقعات تاریخ انسانی میں ہوئے کہ انہیں نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ سائنس کی دنیا کی بیشتر فیصلہ کن معلومات اسی انداز سے ہوئی ہیں۔ اگر چہ تساہل پرست اور عقلِ ظاہر میں گھری انسانیت نے انہیں اتفاقیہ معلومات کہہ کر حقیقت سے چشم پوشی کر لی۔ اور اس نورِ باطن کی جھلک سے اپنا منہ موڑ لیا۔ اسی چھٹی حسِ کی کیفیت سے اوپر، نورِ عقل ہے جو علم لدّنی کا خزینہ ہے۔ یہاں دماغ حق کی روشنی سے پُر ہو کر روبرو ہوتا ہے۔ اپنی کوشش، مجاہدے، ریاضت، پردازِ تخیّل، یا علم و عقل کی کارکردگی کو اس میں دخل نہیں۔ یہ محض فضل ربّی ہے۔ اور یہاں کی معلومات کا تعلق اُدھر سے ہے۔ غالب نے اسی کیفیت کی جھلک پا کر کہا ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

علمِ لدّنی ہی وہ علم ہے جو ایک ظاہری علم سے بے بہرہ فرد کو بھی نصیب ہوسکتا ہے مگر عاشقی شرط ہے۔ گھر کے راز، محرم پر ہی ظاہر کئے جاتے ہیں۔ تمام کلامِ الٰہی کا یہی انداز ہے

کہ محرم کے لئے ناطق (بولنے والا) اور نامحرم کے لئے سامط (گونگا)۔

حضرت موسیٰؑ کو جو علم لُدّنی کی تعلیم دی گئی وہ اسی سطح سے تھی کہ فضل ربّی کے تحت علم و معرفت کے خزینے اپنے اندر سے پھوٹ رہے تھے۔ صاحب کتاب نبی کے لئے یہ تربّیت ضروری تھی۔ اس علمِ لُدّنی کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنا اسی طرح ہوسکتا تھا۔ کہ عقل کو ایک طرف رکھدیا جائے۔ کیونکہ عقل ظاہر بس، سبب اور نتیجہ کی پابند ہے۔ سبب ہی تک ایک ظاہر بیں کی نظر جاتی ہے۔ اور مسبّب الاسباب کو نہیں دیکھتی۔ آخر ہر سبب بھی تو پابند ہے قوانینِ قدرت کا، اور قوانینِ قدرت سے بالاتر اسی کی ذات ہے جب نظر کلی طور پر اپنی عقلِ ظاہر کے وہم و تردّد سے آزاد ہوکر، صرف مسبّب الاسباب ہی پر لگی ہوتی ہے تو، اب ہدایت براہِ راست آتی ہے ظاہر کی تمام نشانیوں کے پیچھے حقیقتوں کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مسبب الاسباب سے رابطہ قائم ہونے کے لئے شدّتِ طلب کی ضرورت ہے۔ گویا عشق کی وارفتگی میں اس توحید کی، کہ میں اور تو کا فرق بھی جاتا رہے۔ جب ساری زندگی، سارے عمل، سارے تخیّل ات، اسی ایک کے لئے وقف ہو جائیں۔ جب حیات کو ایک ہی رخ عطاء ہو، تو سوائے اس کے ہے کیا، جو انسان اپنی مرضی کی دخل اندازی کاروبارِ عالم میں کر سکے! جب تو ہی تو، اللہ ہُو، کی واردات نصیب ہو چکی ہوں، تو ایسے میں جو زبان بولتی ہے وہ حق کی زبان ہوتی ہے جو آنکھ دیکھتی ہے وہ حق کی آنکھ ہوتی ہے۔ اپنے کو کھو کر تو انسان دیکھے کہ تُو ہی تُو، کتنی کھلی حقیقت ہے۔ یہی رابطہ کی بات ہے۔ جب ہر طرح اپنے کو سپرد کر کے، ہر طرح شکستہ ہو کر، ''لَو'' شدّت سے محبوبِ حقیقی کی طرف لگ جائے، تو جوشِ رحمت ہوتا ہے۔ اب اپنا ہی وجود ذریعہ بن جاتا ہے حق بینی و حق گوئی کا۔ اس کے کمین میں آنے کے لئے اپنے سے ماوراء، عقل سے ماوراء، خواہشات اور تخیّلات سے ماوراء ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ یہ بھی عشق کے طفیل، اسی فضل و رحمت کی بات ہے۔ اس وقت نورِ عشق، نورِ عرفان سے رابطہ ہوتا ہے اور خود راضی بہ رضا، رضی اللہ عنہ کے انداز میں۔ اب اس کے ہر عمل، ہر تخیّل، ہر کلام کا سرچشمہ منبع ذات ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ کو اس علم لدنی کی تعلیم حضرت خضر علیہ السلام کے ذریعہ دلائی گئی۔ اس میں یہی رمز ہے کہ خضرِ راہ وہی حق ہے جو عشق کے طفیل اپنے اندر بسا ہے۔ چراغِ راہ خود اپنا نورِ باطن ہے، جو مادّی عقل اور جسم کی کثافتیں ہٹانے کے بعد ہی کہیں روشن ہوتا ہے۔ اگر لو ایک طرف ہی ہو۔ دھیان حق کی جانب شدّت سے لگا ہو تو پھر ہدایت کی راہ اُدھر ہی سے کھلتی ہے۔ اُدھر ہی سے علم عطا ہوتا ہے۔ خدا اور اس کی خدائی زندہ حقیقتیں ہیں۔ مادّہ اور مادّی اسباب تو پابند ہیں اس کی رحمتوں کے۔ رحمت کا آئینہ دار اپنا قلب ہوتا ہے۔ یہ اسرار اس وقت روشن ہوتے ہیں جب سینہ کھلتا ہے۔ کشفِ صدر ہوتا ہے۔

جب منزل بہ منزل، حضرت موسیٰؑ کو ان حقیقتوں کا انکشاف ہوتا گیا، تو خود شناسی کی منازل طے ہوئیں۔ نفس، عقل، حواس، ظاہری اعمال کو شدّتِ عشق کی طہارت حاصل ہوئی، تب کہیں باطن کی راہ کھلی۔ مدارجِ قرب عطا ہوئے۔ پاس بلائے گئے۔ اپنے ہی نفس و عقل کے مادّی حجابات اُٹھے۔ حُسنِ حقیقت اپنے باطن میں چمک اٹھا۔ شرفِ ہم کلامی عطا ہوا۔ آواز آئی، میں تیرا رب ہوں۔ تو اپنے جوتے اتار دے۔ تو پاک میدانِ طوٰی میں ہے۔ میں نے تجھے منتخب کر لیا ہے۔ کون اندازہ لگائے اس کیفیت کا جب منتخب کئے جانے کی نوید مل چکی ہو۔ جب دین و دنیا دونوں کو چھوڑ کر میدانِ حقیقت میں قدم رکھنے کی دعوت دی جا رہی ہو۔ شرفِ ہم کلامی نصیب ہوا تو اس ہم کلامی کے پیچھے کی حقیقتیں جو اپنے باطن میں ہیں، ہم کلام تھیں۔ اسی طرح پہاڑ پر اس پُر ہیبت آگ کا دیکھنا اس آگ کی نشانی تھی جو جستجوئے حق میں اپنے اندر بھڑک اٹھی تھی۔ اب ارتقائے نبوت میں ایک اور کڑی آگے وہی نار ابراہیمی والی بات انفرادی حد سے بڑھ کر اُمت کی سطح پر آنی تھی۔ اسی لئے یہ آگ اس طرح کی تھی کہ جس قدر بڑھتی تھی وہ درخت زیادہ سرسبز و شاداب ہوتا جاتا تھا۔ اور جوں جوں درخت کی شادابی میں اضافہ ہوتا تھا آگ کا اشتعال اور بھی تیز ہوتا تھا۔ وہ آگ خود، انا اُمتی کے رنگ میں اپنے اندر بھڑک رہی تھی۔ اور وہ درخت اُمتِ موسوی کی نشانی تھی۔ جیسے جیسے اُمت کو شادابی عطا ہوتی تھی، اپنے اندر کی آگ اور بھڑک اٹھتی تھی پھر جب حضرت موسیٰؑ نے گھبرا کر اور تھک کر واپس لوٹنا چاہا تو آگ نے آگے بڑھ کر تعاقب کیا۔ حق کی بے چینی اپنی بے چینی سے بھی

ماسوا تھی۔ حق کے لئے، اُمّت، کو چھوڑ کر علیحدہ گوشۂ تنہائی اختیار کر لینا کب نصیب ہوسکتا تھا۔ پیغمبر کا کام یہی ہوتا ہے کہ دراصل بالحق ہونے کے بعد بھی خلقت میں واپس آئے اور اس نورِ حق کی تابانی خلقت کو عطا کرے۔ اب قُرب ومحبّت کا انداز دیکھیں کہ آواز آتی ہے ''یا موسیٰ'' اس محبّت کی پکار پر حضرت موسیٰ کئی بار لبیک کہتے ہیں۔ یار کی طرف کوئی اس طرح لبیک کہتا ہوا جائے تب اسے لبیک کہنے کا مزہ مل سکتا ہے۔ تب کہیں اسے میثاقِ ازل یاد آتا ہے۔ تب کہیں پھر سے قالوبلیٰ کی لذت چکھتا ہے۔ ظاہری شرع وآئین ورسوم کے پیچھے جب میثاقِ محبّت کا رشتہ نصیب ہوتا ہے تو کہیں لذتِ بندگی ملتی ہے۔ عاشق ہی بندہ کہلانے کا مصداق ہوسکتا ہے۔ ایک محبوب ہی کو عروسِ حُسن تک رسائی نصیب ہوسکتی ہے بقول مثنوی مولانا روم، حضرت موسیٰ کو جو عشق کی تعلیم ملی۔ اس کی جھلک ان اشعار میں ہے۔

آتشے از عشق درجاں برفروز　　سر بسر فکر وعبادت را بسوز

موسیا آدابِ داناں دیگرند　　سوختہ جان ودواناں دیگرند

عاشقاں را ہر نفس سوزیدنی ست　　بردہِ ویراں خراجِ عُشر نیست

اسی لئے جب شدّتِ شوقِ دیدار حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر لے آئی تو اس ربِ ارنی کی فریاد کے پیچھے اپنے ہی عشق کی نقاب کشائی ہو رہی تھی۔ اپنے ہی باطن کے پردے چاک ہو رہے تھے۔ اُدھر سے لن ترانی، تم نہیں دیکھ سکتے، عین حقیقت تھا۔ کہ آخر ذات کو یہ مادّی آنکھ کیا دیکھ سکے۔ یا اس کا شعور وادراک اس عقل وحواس کے ذریعہ کیا حاصل ہو سکے۔ بالآخر پردہ در پردہ تجلی بھی ملتی ہے تو بیہوش ہو جاتے ہیں۔ اس عقل وحوّاسی سے پرے کی کیفیتِ مدہوشی میں لذتِ دیدار وجذب حاصل ہوتی ہے۔ کوہ طور جل جاتا ہے۔ کچی نہر ماسویٰ کی 'لا' ہوتی ہے۔ محویت واستغراق سے ہوش میں آنے کے بعد عرض کرتے ہیں۔ ''تو پاک ذات ہے۔ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں'' وہ کون سا گناہ تھا جس کی توبہ کی جا رہی تھی۔ یہ گناہ، ذات کو کسی وجود، کسی صورت، کسی تجلی کسی حد میں محدود سمجھنا یا دیکھنا تھا۔ یہ گناہ دوئی کا گناہ تھا کہ حق کے اتنے کثیر التفات کے باوجود اسے اپنے سے جدا دیکھنا چاہا۔ چنانچہ جب

حقیقتِ ذات واضح ہوئی۔ اپنے ہی اندر نورِ ذات کی جھلک ملی اور وجود و مجرّدات کی حدود سے پرے، ذات کو اپنے میں جلوہ آرا پایا تو آپ نے عرض کی ''میں سب سے پہلے تیری ذاتِ بے چون و چرا پر ایمان لانے والا ہوں۔'' عرفان کچھ دیکھ کر، ایمان کچھ پا کر ہی نصیب ہوا کرتا ہے۔ یہ ذاتِ بے چون و چرا کا انکشاف کچھ اسی قسم کا تھا جو حضرت ابراہیمؑ کو محویت و استغراق کی حالت میں ہوا تھا کہ فرمانے لگے تھے۔ میں نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یہ عرفانِ حقیقت اپنے ہی اندر کی بات تھی۔ اب کوئی دوئی نہ تھی۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ کو ہم کلامی حاصل ہوئی تو آپ نے فرمایا ''میں تیری آواز سنتا ہوں اور آہٹ پاتا ہوں۔ مگر نہیں دیکھتا کہ تو کہاں ہے۔ اس پر آواز آئی'' میں تیرے ساتھ ہوں، تیرے پیچھے ہوں، تیری جان سے زیادہ تجھ سے نزدیک ہوں، اس وقت حضرت موسیٰؑ کا یہ عالم تھا کہ ہر سمت، ہر جہت سے، اپنے ایک ایک بُنِ مُو سے، اللہ کا کلام سن رہے تھے۔ یہ نمودِ حقیقت تو کھلے طور پر اپنے باطن ہی کی واردات تھی اپنے ہی میں تو سارا عالم سمٹ آیا تھا۔ یہ اپنا باطن ہی ہم کلام تھا۔ شعور اس کو کیا پاتا۔ یہ تو ذات کو ''فی انفُسکُم'' یا ''وسِعَ کرُسِیُّہُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْض'' کے رنگ میں پانا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت موسیٰؑ کو اپنے ظاہر و باطن کی ہم آہنگی یعنی خالص توحید کی تعلیم دلائی گئی پھر ہر قسم کی بدنی اور جانی عبادات بتائی گئیں۔ جن میں یادِ الٰہی اور ذکر خصوصیت سے تھا۔ ظاہر باطن کی ہم آہنگی کو قیام حاصل ہونے کے لئے اس اندرونی شدّتِ شوق کو، ایک آئین و ادا، ظاہر بیں بھی بخشی گئی، کہ لباسِ شریعت میں بھی اسی یار کی آئینہ داری، اس پیکرِ انسانی کے ذریعہ ہو سکے۔ اس ادائے دلبری کو دوام عطاء کرنے کیلئے قیامت پر ایمان، اور تمام اعمال و عبادات کی پونجی، آخرت کا عقیدہ، اور قانونِ مکافات مقرر کر دیا گیا۔ اس طرح اجتماعی طور پر بھی ایک گروہ اُمت کو اپنے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اور موسوی اسلام کو ایک مستند اور مقرر طریقۂ کار عطا ہوا۔ عالمِ انسانی کو ایک نوید و امنگ عطا ہوئی۔ تاکہ اس کی نظر اس مختصر جسمانی زندگی کی حدود سے پرے دوام و بقا کی متلاشی ہو۔ اور صرف اُمت و جمعیّت کی صورت میں اپنی منزلِ اعلیٰ کی طرف گامزن ہو۔

اب وقت تھا کہ ظہورِ نبوتِ موسوی، پُورے جاہ و جلال سے زمانے میں جلوہ افروز

ہو۔مصر کے مظلوم ومجبور بنی اسرائیل کی یاد اب بھی ستاتی تھی۔فرعون کی جھوٹی خدائی قوّت کو، اپنے سچے خدا کی طاقت کے سامنے سرنگوں کرنے کی تمنا تھی۔اس لئے آپ کو یہ مشن سپرد ہوا کہ فرعون کی طرف جائیں۔ اس کی اصلاح کریں۔ اور بنی اسرائیل کو اسکے ظلم سے نجات دلائیں۔توّکل برخدا،اب گویا عقل کی سطح سے ایک ناممکن العمل حکم کی پابندی کرنی تھی۔کہاں فرعون کا جاہ وجلال،قوّت وسپاہ اور کہاں تن تنہا ایک فرد۔ جس فرعون کے ڈر سے بچپن میں بھاگے تھے،اب اسی سے نبردآزمائی کے لئے منتخب ہوئے،حق و باطل کی صف آرائی کے لئے اس سے بہتر صورت اور کیا ہوسکتی تھی کہ فرعون کو اپنے مادّی وسیلوں پر ناز اور بندۂ مومن کو صرف ذاتِ حق پر بھروسہ۔ اب مردِ حق کو اپنے وجود کے ذریعہ ہی حق کی قدرتوں کا اظہار کرنا تھا۔عقل کی رسائی تو ان وسعتوں کو کیا پاسکتی ہے مگر باطن پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک رحمتِ ربّی ہی تھی، کہ اس کام کے لئے منتخب کئے گئے۔ جو بچپن سے قلب و جان میں پیوست تھا۔ یعنی ایک مظلوم انسانیت کی نجات۔ زبردستوں کے ہاتھوں سے زیردستوں کی نجات۔ اللہ کے منکروں کے ظلم و استبداد سے اللہ والوں کا چھٹکارا۔ظواہر کے دلائل تسلیم کئے جاتے تو مشن ناممکن العمل۔کہاں بے یارومددگار یکہّ وتنہا نوجوان اور کہاں ایک جابر وظالم،مطلق العنان۔ نہ اپنے گردپیرویان، نہ لشکر وحشم۔ نہ زیردستوں کی تربّیتِ جنگ کا وسیلہ، اورطرفہ تماشا یہ کہ اب اس نوجوان کو دوسروں کی جانیں بچانے کے لئے اسی ملک میں بھیجا جارہا تھا۔ جہاں سے اپنی جان بچا کر کچھ سال قبل بھاگنا پڑا تھا۔مگر جب اور اب میں بڑا فرق تھا۔اب خوداعتمادی تھی۔اب ذاتِ حق اور اس کی احکم الحاکمینی پر مکمل بھروسہ تھا۔ نہ خدا کو آسمان سے اترنا تھا نہ فرشتوں کو۔اس کارزار جہان میں انسان ہی کو جلالتِ حق بن کر باطل پر ضربِ کلیمی لگانی تھی۔ اب اس مردِحق کا علم و ہدایت کا سرچشمہ عقل نہ تھی۔ بلکہ بواسطۂ علم لُدّنی اپنا رب۔ چنانچہ اُدھر حکم ملا اور اِدھر بلا تردّد،توکل براللہ،مصر کی طرف روانہ ہوئے۔ یدِ بیضا، عصا اور سات معجزے اس مشن سے قبل عطا ہو چکے تھے۔ ان ہی کے فیضان سے اس طلسم خانۂ جہان میں بندۂ حق کی نئی شان کی رونمائی ہونی تھی۔ باطنِ عالمِ انسانیت اب اس سطح پر آچکا تھا، کہ مردِ مومن خوددست و بازوئے حق ہوکر باطل کی غلامی سے انسان کو نجات دلائے اور ایک گروہِ

اُمت کا رشتہ حق سے بندھائے۔

حضرت موسیٰؑ کا سہارا بڑا مضبوط تھا۔ جس رب نے غربت و غریب الدّیاری میں پالا، وہی تو سب سے بڑھ کر قوی و حاکم تھا۔ اسی کی شان ذوالجلال اظہار اب اس انداز میں کرنا تھا کہ جہاں پہنچے، باطل کی صفوں میں لرزہ پڑ گیا۔ جب مردِ حق، خود پیکر ذات بنکر شانِ خداوندی کے اظہار کا ذریعہ بنے تو کون اسکی خشیت حُسن کی تاب لا سکتا ہے! اب اس نور باطن، جلوۂ طور سینا، ذوق کلیمی کو انفرادی حد سے نکل کر اُمت و جمعیّت کی خاطر پیکرِ جلالت و ضربِ کلیمی کی شکل میں رونمائی کرنی تھی۔ معجزات، اپنے ہی حُسن کا اعجاز تھے۔ یہ وہی حسنِ حقیقت تو تھا، جو اپنے باطن میں پوشیدہ تھا۔ اور اب اسکی تابانی جہان کو دکھانی تھی۔ اب اپنی اُمت کا رخ بھی جلالت کی جانب پھیر دینا مقصود تھا۔ کبر و جلال و بزرگی اسی ایک حق کو زیب دیتی ہے اور بندۂ حق اپنی شان کے ذریعہ اسی حق کی شان دکھا رہا ہوتا ہے۔ اسی لئے جب بندۂ حق کا سامنا اس فرعون سے ہوتا ہے جو جھوٹی خدائی کا دعوی کرتا تھا، تو اسی بندۂ حق کی جلالت کے آگے وہ جھوٹا خدا شرمسار ہوتا ہے اور کیسا احسانِ عظیم ہے اپنے بندہ پر کہ جھوٹے خدا کے مقابلے کیلئے خود سامنے نہیں آئے بلکہ خود پسِ پردہ رہ کر اسی بندۂ مومن سے اپنی شان کا اظہار کرا لیا۔ شانِ کریمی دیکھیں کہ جو فرد ان ہی کے احسان کے بل بوتہ پر باطل سے برسرِ پیکار ہے۔ اسی کا الٹا احسان مانیں۔ **هل جزاء الاحسان الاالاحسان**

جلال موسوی گویا خود جلالِ حُسنِ ذات تھا۔ اسی کی تابانیٔ حُسن سے دنیوی اقتدار و نمود و زیبائش کے چراغ ماند پڑ گئے۔ اسی حُسن کی جلالت سے فراعینِ زمانہ، ساحرانِ کور باطن، سامریانِ ظاہر پرست لرزہ براندام ہو گئے۔ ان کے دعوے جھوٹے ہو گئے۔ انسان مجمع الصفات، مصداقِ علم الاسماء، حامل اسرارِ خفی و جلی، خود مظہرِ حق ہو کر، جلال خداوندی کی شان زمانہ کو دکھاتا ہے۔ اس کے آگے سب عقل و دانش درماندہ ہو جاتے ہیں۔ سارے غروروں کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ سارے خداوندانِ باطل کالعدم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے شانِ موسوی۔ یہ ہے موسوی اسلام کا وہ راز جس کی تابانی ہر زمانہ میں مردانِ حق کے باطن میں محفوظ ہے۔

افسوس تو یہ ہے کہ ظاہر بینِ شرع و آئین کے متوالوں نے اس جلال کی ظاہری صورت یعنی قہر، غضب، غصہ کہہ کر، اس وجودِ باصفا کی خشیتِ حُسن پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے **ویَبقٰی وجہُ ربکَّ ذُوالجلالِ والاکرام** کی حقیقت کو نہ پایا جس وجہِ ربّی کو بقا ہے۔ وہ یہی جلالت کا پہلو ہے، یہ ہی تو موسوی اسلام کا احسان ہے زمانہ پر کہ اس کی شانِ جلالت خود آئینی داری کرتی ہے شانِ ذوالجلال کی۔ اس کے جلالِ حُسن کے آگے تمام باطل قوّتیں کالعدم ہو جاتی ہیں۔ جلالِ خداوندی کے مظہر کے آگے کون صف آراء ہوسکتا ہے۔ یہی جلال تو پیکرِ انسان کو شیرِ خدا کی زینت بخشتا ہے۔

جلال اللہ کا ظاہر ہوا شیر خدا ہو کر

اسلام کو یہ شان حضرت موسیٰؑ کی عطاء کردہ ہے۔ شانِ ربّ ذوالجلال بنے تو پوری اُمت بنے یہ جلال نہ قہر و غضب ہے نہ غصہ و عذاب ہے عالمِ انسانیت پر۔ بلکہ یہ جلال تو اکرام و انعام کی شان ہے۔ جو بندہ مومن کو عطا ہوتی ہے اور اسی لطف و کرم کی جلالت میں ایک عالم کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ اسی کی تابانی سے زنگار خانۂ عالم میں ہدایت کے چشمے کھل جاتے ہیں۔ اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے عین بندگی کے تحت، اپنے مشن سے قبل عرض کی ''میرا سینہ کھول دے اور میرا کام آسان کر دے اور کھول دے اپنے بھید اور میری زبان تا کہ لوگ میرا قول مانیں اور سمجھیں۔'' اب دیکھیں تو فرعون سے آپکا مکالمہ، معرفتِ حق کی کیسی راہ کشادہ کرتا ہے! نہ غصہ کا اظہار ہے، نہ سخت الفاظ، نہ قہر الٰہی کی دھمکی۔ فرعون نے دریافت کیا ''یہ **رَبُّ الْعَالَمِیْن** کیا؟'' آپ نے جواب دیا ''رب سموٰات اور ارض کا اور جو ان کے درمیان ہے بشرطیکہ یقین کرو''۔ ظاہری عقل کی سطح سے اس مکالمہ کو نہ دیکھا جائے۔ مردانِ خدا کا کالم رمز سے پُر ہوتا ہے۔ رب کیا ہے۔ پالنے والا، حیات و نمو کی قوّت عطا کرتے ہوئے پالنے والا۔ نہ صرف جسمانی نمو بلکہ قلبی و روحانی حیات و نمو یعنی کُن ... میں ارتقائے روحانی عطا کرنے والا۔ سموٰات کیا ہے؟ قلب اور روح کے مدارج اعلیٰ، ارض کیا ہے؟ نفس اور لطیفۂ نفس کے

مدارج اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ آپ نے فرعون کو یہ بھی کہا۔ ''مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار بشرطیکہ تم عقل رکھتے ہو۔'' گویا اس طرح آپ نے انسان کی تمام مادّی و روحانی دسترس و رسائی کی حدود بیان کر دیں جن کو وہی قادرِ مطلق کُن کے انداز میں حیات و ارتقاء عطا فرما رہا ہے۔ یہ مشرق و مغرب تمام مثبت و منفی صفات کا ذکر تھا جو نفس کی منزل سے لے کر روح کی منزل تک اور ان کے علاوہ ہیں۔ ان کی جانب ربوبیت کرنے والی ذات کو اپنا رب قرار دیا۔ یہی دلیل حقیقتِ ذات کی وضاحت کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے سامنے پیش کی تھی۔ ظاہری مطلب تو یہ تھا کہ یہ جو نظامِ عالم کو قائم کئے ہے۔ اور کوئی شے، اس کے قوانین کی سرتابی نہیں کر سکتی، سب اسکے حکم و قدرت کے تابع ہیں، وہی رب العالمین ہے تم سمجھ سے کام لو تو تمہاری عقل اور وجدانی پکار، اس قادر مطلق ذات کی گواہی دیں گے۔ اور باطنی مطلب یہ کہ حیاتِ روح اور ارتقائے باطن اس کے دستِ قدرت میں ہیں۔ اپنی کوششوں کو اس میں دخل نہیں۔ ظاہر باطن کی ہر مثبت و منفی صفات پر وہ قادر ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کی بات پر فرعون کو کچھ نہ سوجھی تو بولا۔ ''مصر میں تو میری خدائی ہے'' موسیٰؑ تم دونوں بھائیوں کا پروردگار کون ہے؟'' اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی (یعنی حدود مقرر کر دیں) پھر راہ دکھائی (یعنی ارتقا کی منزل پر ڈالا)'' یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ برگزیدہ ہستیوں کی ہر بات رمز سے پُر ہوتی ہے ظاہر بینی سے قطع نظر ان کی نگاہ میں ہمیشہ گہرائی ہوتی ہے۔ یہی کچھ تمام کلام ربّانی کی خوبی ہے۔ کہ اسے سطحی معنوں تک کہاں محدود رکھنا۔ غور کریں۔ صورت کا لفظ کتنا مناسب ہے ہر تصویر، نہ صرف مصور کے وجود پر دلالت ہے بلکہ خود مصوّر کی عکاسی کر رہی ہے۔ ایسا مصوّر جس نے چیزوں کے وجود کو جسم بخشا یہ بھی تمام رموز سے پُر۔ پھر اس میں جان ڈالی، جو خود ایک رمز ہے۔ پھر اسے فروغ کی راہ پر، ارتقائے ظاہر و باطن کی راہ پر ڈالا۔ جس کے پس پردہ بھی رمز در رمز ہیں پھر حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ ''جب تو سورج اوتار کا بیٹا ہے تو خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اب تو اسکو مغرب کی طرف سے نکال۔'' یعنی روح جو امرِ ربّی ہے مقررہ قانون کے تحت ہماری زندگیوں میں عمل پیرا ہے۔ اب تو اس امرِ ربّی کو بدل کر اپنا

حکم دکھا دے کہ ہمارے وجود کی عمل پیرائی کے تحت روح ہو جائے۔ فرعون کو معلوم تھا کہ نہ اس میں یہ طاقت ہے، نہ اس کے جھوٹے دیوتاؤں میں کہ کسی قسم کی نمو، فروغ یا ارتقاء کسی کو دے سکیں۔ جب اپنی مجبوری پر نظر گئی تو یہی بات سمجھ کر وہ کافر حیران رہ گیا۔ جب زچ ہوا تو دھمکی دینے لگا کہ تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر دوں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ خواہ میں تیرے پاس روشن چیز (یعنی معجزہ) لاؤں۔'' فرعون نے کہا ''اگر سچے ہو، تو اسے پیش کرو'' پس حضرت موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالدی وہ اسی وقت صریح اژدھا بن گئی اور آپ نے اپنا ہاتھ جو بغل سے نکالا تو اسی دم دیکھنے والوں کے لئے سفید نظر آنے لگا۔ ان معجزوں کے نکات پر غور کرنا ضروری ہے۔ عصاء، جسم کیلئے بیرونی سہاروں کی نشانی ہے جو انسان پکڑ لیتا ہے اور اس حد تک کہ اپنا چارہ ساز ان ہی کو سمجھنے لگتا ہے۔ جب یہ سہارے بھی اللہ کے امر پر بھروسہ کرتے ہوئے زمین پر پھینک دئے جاتے ہیں تو اپنا بھی ایمان پختہ ہوتا ہے۔ اب خدا کے سہارے پر بھروسہ ملتا ہے۔ اور دنیا کے ان لوگوں کی بھی نگاہ کھلتی ہے جو ان سہاروں پر بھروسہ کئے تھے۔ ان کیلئے یہی سہارے اژدھا بن کر نظر آتے ہیں کہ جیسے اب تک وہ ان کی باطنی صلاحیتوں، اعتماد اور خود اختیاری کو اژدھا بن کر کھا رہے تھے۔ غور طلب بات ہے کہ ارشادِ الٰہی یہ نہیں ہوا کہ اس عصا سے سانپوں کو مار بلکہ یہ کہ اسے پھینک دے۔ یہ سہارا بھی اپنے اور میرے درمیان سے ہٹا دے پھر دیکھ کہ یہ برکتِ بسم اللہ خود ہی یہ عصا کس طرح ان سانپوں، ان نفس و مادّیت کے حشرات الارض کو کیسے ختم کرتا ہے۔ اس طرح کفار پر یہ ظاہر ہو گیا کہ موسیٰؑ کا سہارا ایسے خدا پر ہے جو قادرِ مطلق ہے۔ مادّی اور عقلی دسترس سے پرے بھی اس کا حکم چلتا ہے۔ اسی طرح کے انوار جیسے کرامت، فیضان، نصرت، برکت، رحمت، جلالت کچھ اس پیرایہ میں کارفرما ہیں کہ مادّی عقل و دانش حیران ہیں۔ اب بغل سے ہاتھ نکالنے اور یدِ بیضا پر غور کریں! بغل میں ہاتھ دے کر پھر نکالنا اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اپنے باطن کے حجاب میں جو اپنی باطنی قدرتیں پوشیدہ ہیں۔ ان کا اظہار عالمِ خلق میں کرو۔ یوں انسانی سَتر کا حیادار پہلو علم الحیات میں بغل کو ہی کہتے ہیں۔ ہاتھ عمل کا ذریعہ ہے۔ انسانی دماغ کی بابت بھی اب تحقیق سے کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں انسان کا

دماغ اسی لئے بڑھ گیا کہ انسان نے اپنے ہاتھ سے زیادہ کام لیا۔ یدِ بیضا سے مراد یہ تھی کہ وہ نور کے فیضان جو دنیا میں دستِ عمل کی صورت میں اللہ نے عنایت کئے ہیں۔ ان کا عملی طور پر نفاذ انسان کو کرنا چاہیئے۔ کہ منشائے حق یہی ہے۔ گویا جو قدرتیں انسان کے باطن میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ انکو ظاہر کرنا ہے۔ انسانیت تک پہنچنا ہے، پہنچانا ہے، موسوی پیغام کی جان یہی ہے کہ انسان کو اس کے مقام سے آشنا کر کے اس کو منشائے حق کے نشر کا ذریعہ بتاتا ہے اور مادّی سطح تک ہی نہیں بلکہ صفاتِ حق اور مجرّدات کا علمبردار بنا کر۔ اسی لئے اس کے دستِ عمل کو دستِ قدرت گردانتا ہے۔ یدِ بیضا اپنے ہاتھ میں نورِ حق کی تابانی، خود اپنے وجود میں سے حقیقت کے ظہور کی نشانی تھی۔ دستِ قدرت اور امر باللہ کے اظہار کی دلیل تھی۔ عصا اور یدِ بیضا اور دیگر معجزات اس جلالت اور باطنی قوّتوں کی صرف نشاندہی کر رہے تھے جو حضرت موسیٰؑ کی ذاتِ مبارک کو حاصل تھیں۔ مخزنِ معانی تو خود حضرت موسیٰؑ تھے۔ اسی لئے آپ جلیل القدر پیغمبروں میں شمار ہوتے ہیں، آپ کا خطاب کلیم اللہ کہ آپ کو تجلّی وہم کلامی کا شرف حاصل تھا۔ اب ہر ایک شخص تو خدا سے ہم کلامی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی دیدار کا اہل ہو سکتا ہے، زمانہ کی ضرورت کے لحاظ سے عوام کو بس اپنی مثال ہی پیش کی جا سکتی تھی، اور جو ہدایت اللہ سے آپ تک پہنچی وہ انہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ چنانچہ حق کی طرف خلقت کے اندازِ رجوع کے لئے آپ نے وہی صورت مقرر فرمائی۔ جس کی وہ قوم اہل تھی، یعنی ظاہری شرع و رسوم اور پابندیٔ قوانین۔ عرفانِ حقیقت کی منازل کی طرف رجوع ہونے کا نہ دینِ موسوی میں تذکرہ کیا گیا نہ ہی گنجائش نظر آتی ہے۔

آخر یہ موسوی اسلام کا صرف شریعت پر زور اور شریعت کی یہ سختی کس لئے تھی؟ بات یہ تھی کہ یہ زمانہ سحرِ عقل کا تھا۔ اور ان توہّمات و بیرونی اثرات کا جن سے انسان میں اعتمادِ خودی اور اعتمادِ شخصیت جاتا رہا۔ سحر کے زیرِ اثر انسان کی عقل، حیرانگی اور بے چارگی میں مبتلا ہو گئی۔ انسان کو اپنے مادّی وجود، اپنی صلاحیتوں اور ان انعاماتِ قدرت پر جو اسے تسخیر فطرت کیلئے عطا ہوئے تھے بھروسہ نہ رہا۔ اسی لئے شرعی رسوم کی سختی سے پابندی اور شدت سے رجوع لازم قرار دیا گیا۔ اور اس طرح انسان کا عقلی رُجحان دین و اراکین کی پابندی کی

عادت میں قدرتاً توہّمات سے ہٹ گیا۔ یہ اس لئے بھی تھا کہ ظاہر کا اثر باطن پر پڑ سکے اور اپنے پر سے کھویا ہوا بھروسہ پھر سے واپس آ سکے۔ عقل کو معقول کرنے کیلئے اور زیادہ اتباع شریعت کا رخ دیا گیا۔ نفس کے ساپنوں اور سحر نے جو نورِ عقل و ایمان پر پردے ڈال دئے تھے اور انسان کو مجبور سا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو پھر سے اٹھانے کے لئے اللہ کا سہارا معجزۂ عصا، اور یدِ بیضا وغیرہ باطنی صلاحیتوں کی صورت میں پیش کیا گیا تا کہ انسان اپنے نورِ باطن کی صلاحیت کو پھر سے پا سکے۔ ایک اور وجہ شریعت کی سختی کی یہ بھی تھی کہ بت پرستی کی رسومات کا مقابلہ کرنے کیلئے اپنی بھی مذہبی رسومات کو اس قدر اہمیت دینی تھی کہ انکی تابندگی کے آگے بت پرستی کی رسومات ماند پڑ جائیں۔ یہاں موسوی دین کی رسومات اور پابندیوں کا مختصراً حال بیان کر دینا ضروری ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا خیمۂ عبادت سونا منڈھے ہوئے تختوں سے بنا تھا۔ یہ تختے اندر باہر قیمتی کتان کے پردوں سے ڈھکے رہتے تھے اور ان پردوں پر فرشتوں کی تصویریں نقش تھیں۔ خیمہ کے ان تختوں اور پردوں کے اوپر ایک سرخ غلاف تھا۔ اور اس غلاف کے اوپر موٹے چمڑے کا غلاف تھا۔ جس کی وجہ سے نہ باہر کی روشنی اندر آ سکتی تھی نہ گرد و غبار، خیمہ کے دو حصے تھے بڑا حصہ عبادت گاہِ عام تھا۔ اس میں ایک سونا منڈھی ہوئی میز پر تبرک کی بارہ روٹیاں رکھی رہتی تھیں جنہیں حضرت ہارون کے علاوہ کوئی نہ چھؤ سکتا تھا، میز کے سامنے سات چراغوں کا شمع دان زیتون کے تیل سے روشن رہتا تھا۔ ایک کونہ میں ایک ہاتھ مربع چھوٹی سی قربان گاہ تھی اس قربان گاہ کے چھت اور اس کے سینگ سونے کے تھے۔ اس پر سونے ہی کا کلس تھا اور خوشبوؤں کا بخور اس قربان گاہ پر جلتا تھا۔ خیمہ کے اس حصہ میں سے پردہ اٹھا کر دوسرے حصے میں جا سکتے تھے۔ اس حصے کا نام حظیرۃ القدس تھا۔ گویا یہ خدا کے جلال کا خاص مسکن تھا۔ اس مقدس ترین جگہ میں سوائے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون کے یا جسے وہ اجازت دیتے، کوئی اور داخل نہ ہو سکتا تھا۔ بغیر اجازت داخل ہونے کی سزا موت تھی۔ اس مقدس مقام میں تابوتِ سکینہ بھی رکھا رہتا تھا۔ یہ گراں بہا لکڑی کا بنا تھا۔ اور سونے سے منڈھا تھا۔ اس میں الواحِ توریت رکھی رہتی تھیں۔ ایک مرتبان میں من کا نمونہ تھا اور حضرت موسیٰؑ کا

عصا اور بنی اسرائیل سے لیا ہوا عہد نامہ، صندوق کے ڈھکنے پر دو فرشتوں کی تصویریں تھیں۔ اسی صندوق کے قریب بیٹھ کر حضرت موسیٰؑ پر وحی آتی تھی۔ خیمے کے باہر کافی میدان اور صحن تھا۔ جس کے گرد کتان کی قناطیں تھیں۔ ڈیوڑھی کے دروازہ کے قریب پیتل کا حوض تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس حوض میں وضو کرنا ہوتا تھا۔ آگے پیتل کی قربان گاہ تھی۔ عام لوگوں کو خیمے کے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ اس قربان گاہ تک سب آتے تھے اور قربانیاں چڑھاتے تھے اس جگہ گویا شکستہ حال گنہگار آدمی کی خدائے سے ملاقات ہوتی تھی اور گرے ہوئے آدمی بحال کئے جاتے تھے۔ برکت ورحمت و معافی حاصل ہوتی تھی۔ قربانی کے جانور، بیل یا برّے ہوتے تھے جو گناہوں کا اقرار کرنے کے بعد کاٹے جاتے اور ان کا گوشت عبادت کرانے والے کاہن کھاتے۔ اس کا کچھ حصہ حضرت ہارونؑ کو بھی ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر آدمی ناپاک متصوّر ہوتا۔ طریقۂ طہارت یہ تھا کہ ایک بے داغ سرخ گائے، قربان کرکے اس کا گوشت پوست جلا دیا جاتا، اسکی راکھ ایک کورے برتن میں جمع کر لی جاتی اور بہت سے پانی میں کھول لی جاتی۔ کاہن، زدفا درخت کی ایک ٹہنی، اس آبِ طہارت میں بھگو کر خطا کار کے بدن پر چھڑکتا جس گھر میں کوئی آدمی مر جاتا اس کے سب آدمی سات دن کے لئے ناپاک ہو جاتے۔ یہ کسی کو چھو لیتے تو وہ بھی کئی دن کیلئے ناپاک جو جاتا۔ برہمنوں میں بھی اب تک یہی رواج ہے۔ موسوی شریعت میں عورت، بچّہ پیدا ہونے کے بعد ۶۶ دن ناپاک رہتی۔ ان دنوں اور اسی طرح دوسری ناپاکی کے دنوں میں اگر کسی آدمی کا ہاتھ اسے لگ جاتا تو وہ بھی ناپاک ہو جاتا۔ ایسی حالتوں میں ناپاکی کی معیاد مقرر تھی۔ یہ معیاد ختم ہونے کے بعد ہی آبِ طہارت بدن پر چھڑکا جا سکتا تھا۔

شریعت موسوی میں سزائیں بھی سخت تھیں۔ کلمۂ کفر کے لئے سزائے موت، ماں باپ کی بے ادبی کرنے پر یا گستاخی سے ان کے ساتھ پیش آنے پر سنگسار۔ بعض صورت میں چوری کرنے والے بھی سنگسار۔ باقی سزاؤں کا اس سے اندازہ لگا لیں۔ موسوی شریعت میں قربانی، نذر، غسل، طہارت، نماز، روزہ، حلال، حرام، نکاح، طلاق، ممانعت سود، فتنہ، جہاد اور جرموں وغیرہ کی سزائیں ہی آئینِ دین اور اور جانِ دین ہیں۔

وہ دس احکام جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر عطا ہوئے یہ تھے۔

1۔ خداوند تیرا جو تجھے مصر سے اور غلامی کے گھر سے نکال لایا میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لئے کوئی دوسرا معبود نہ ہو۔ تو اپنے لئے کوئی صورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر اور نیچے زمین پر یا پانی میں ہے مت بنا۔ تو اپنے تئیں ان بتوں کے آگے مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر۔ کیونکہ میں خداوند تیرا خدا، غیور خدا ہوں۔

2۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ مت لے۔

3۔ تو سبت کا دن پاک رکھنے کے لئے یاد کر۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنے سارے کام کاج کر۔ ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے اس میں کچھ کام نہ کر۔

4۔ تو اپنے ماں باپ کی عزت کر تا کہ تیری عمر دراز ہو۔

5۔ تو خون مت کر۔

6۔ تو بدکاروں سے باز رہ۔

7۔ تو چوری مت کر۔

8۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

9۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔

10۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو کے ناموس کا خیال رکھ۔

ان دس احکامات سے ظاہر ہے کہ دینِ موسوی نے انسانیت کو انسانیت کی راہ پر چلنا سکھایا۔ خدائے واحد کی عظمت و بزرگی کا اعتماد اور بھروسہ دلا کر، باطل کے آگے گردن خم کئے رکھنے سے بچالیا۔ بُت پرستی اور شرک سے نجات دلاتے ہوئے انسان کو، اپنے مقام تک پہنچا دیا، پاکی، طہارتِ ظاہر و باطن، اور تذکیۂ نفس کے لئے ایک راہِ عمل مقرر کر دی۔ تا کہ عام انسانیت بھی رجوع الی اللہ ہو سکے۔ ساتھ ہی ممنوعات سے بچنے کی تاکید اور جمعیّت کی زندگی کو، انفرادی نفسانفسی سے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا تا کہ ان آلائشوں سے بچ کر انسان، لطیفۂ

نفس کے مقام تک عروج حاصل کر لے۔

اب ایک سطحی نظر سے وہ تمام زمانہ دیکھا جائے جو حضرت موسیٰؑ نے قوم بنی اسرائیل کی اصلاح میں صرف کیا۔ مصر واپس جانے سے پہلے کا زمانہ۔ وہ زندگی کی تمام سختیاں جو نبوت اور بعد نبوت کے زمانے میں جھیلیں وہ یک و تنہا، فرعون اور ساحرانِ مصر سے مقابلہ، وہ عبورِ دریائے نیل، وہ دشتِ سینا میں صحرا نوردی، وہ قوم کی عاقبت اور دنیا سنوارنے کی جدوجہد اور قوم کے لئے رہائش و رزق کا انتظام۔ تو ان میں سے ہر ایک ناممکن العل مشنِ۔ ہر ایک پوری توجہ اور شدّتِ جہد کا طالب اس پس منظر میں کہیں صحیح معنوں میں ذاتِ موسوی کی جھلک نظر آ سکتی ہے۔ ایک عظیم المرتبت نبی، ایک عظیم الشان مصلح، ایک صاحبِ عظمت و جلال ہادی۔ مگر یہ بھی عجب ستم طرازی ہے کہ خود آپ ہی کے زمانہ میں اس قوم نے جس پر اللہ کے احسان پر احسان ہوئے۔ گؤسالہ پرستی اختیار کی۔ آخر یہ گؤسالہ پرست انسان کیونکر بن جاتا ہے۔ گائے، دودھ دینے والی، ربوبیت کی نشانی۔ بیل، نشل کشی، کھیتی باڑی کا ذریعہ۔ دونوں، تن آسانی اور دولت جمع کرنے کا وسیلہ۔ نتیجتاً یہی مال و دولت کی نشانی بن گئے اور سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا جو اس کے کمالِ سحر سے بولتا تھا۔ کہتے ہیں، حضرت جبرئیل کے گھوڑے کی ٹاپ کے نیچے کی خاک اس بچھڑے کے منہ میں اس نے ڈالی اور وہ بولنے لگا تھا۔ یہ بھی عجیب رمز ہے کہ ان لوگوں کو اس جادو پر نہ وہم آیا، نہ بدگمان ہوئے، نہ انکی عقل و دانش نے اس سے انکار کیا۔ مگر حضرت موسیٰؑ نے اس سے کہیں زیادہ معجزے دکھائے، پھر بھی انکی رسالت سے انکار کیا۔ بات یہ ہے کہ ہر جنس اپنی جنس کو پسند کرتی ہے۔ ''گائے شیرِ نر کے آگے کہاں جاتی ہے۔ باطل لوگوں کو باطل بھاتا ہے۔ اور حق شناسوں کو حق، دل کا آئینہ صاف ہوتا تو اچھے بُرے کی صورت کی تمیز کرتے۔ محرم ہو جاتے تو اصحابِ کہف کے کتے کی طرح انسان بن جاتے۔ یہ لوگ عشق و محبّت سے مبرّا تھے، وگرنہ ؎

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جُداست　　عاشقاں را مذہب و ملت خدُاست

محبّت و وفا کی بنیادیں قلب میں ہوتی ہیں۔ وہاں نہ کردار میں سوکھا پن ہے نہ خود

غرضی، نہ حرص، وہاں تو اپنی تمام صلاحیتیں۔ اپنے تمام انعامات اپنے تمام کردار کو محبوب اور اسکی اُمت کے نام پر وقف کرنا عین سعادت ہوتا ہے۔ انعاماتِ خداوندی کا شکرانہ اسی طرح ادا کیا جا سکتا ہے، اور نتیجہ میں خود اعتمادی، ایمان اور توکل کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ شکرانۂ بندگی اسی طرح ادا ہوتا ہے کہ مخلوقِ خدا سے محبّت کا لگاؤ قائم ہو۔ محبّت کا وہ پیمانِ طریقت جس میں مسکینی، عاجزی، اخوت، پاکی، طہارت یادِ الٰہی کی جھلک اپنے کردار میں ہو، آئین موسوی کی جان ہے۔ حقیقت کی تلاش میں تڑپ، براہیمی، اور قلب میں انوارِ ذات کی تابانی موسوی اسلام کی شان ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو ایک جویائے حق کو اپنے روحانی ارتقاء کی جانب گامزن کرتا ہے۔ وہ ارتقائے باطن جس میں نفس سے لطیفۂ نفس تک کی منزل طے کرانے کے لئے شریعت کی سختی سے پابندی کو لازمی قرار دیا گیا۔ اپنے کردار، اپنے تخیّل، اپنے اعمال، اپنی عبادات میں خلوصِ نیت کی شرط، بنیادی طور پر قائم کی گئی۔ تا کہ اس پاکیٔ تخیّل و عمل سے تذکیۂ باطن ہو۔ پھر سبب اور نتیجہ میں گرفتار، عقلِ ظاہر کو اس اطلاع کے تابع کر دیا گیا جو علمِ لدّنی کے ذریعہ حاصل ہو سکے۔ اس طرح ہدایت کے ذریعہ براہِ راست حق سے قائم کرا دیا گیا۔ اور انسانیت کی اس ادائے والہانہ، اندازِ دلبرانہ کی جھلک ملائک نے بھی دیکھ لی، جن کا کام صرف عبادت کرنا تھا۔ اس رابطہ کے بعد ہی طالب میں وہ شدّتِ شوق کی جھلک آ سکتی تھی کہ میں تجھے دیکھوں گا، میں تجھ سے بات کروں گا، اور اس کے بعد ہی ان تمام معجزات کے اعجازات قوم کی عملی زندگی میں کارفرما ہو سکتے تھے۔ جنکی جھلک حضرت موسیٰؑ نے زمانے کو دکھائی۔ ان معجزات کے پسِ پردہ یہی بات تھی کہ اپنی قوّتِ بازو پر اعتماد، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی طرف توجہ، نفسانفسی، حرص و طمع سے انسانیت کو نجات۔ قوم و ملت کو ایک مکمل زندگی کا لائحہ عمل۔ ایک تہذیب یافتہ نفس اور اسکی روشنی میں روزمّرہ زندگی، خالق و مخلوق کے درمیان ایک مضبوط رابطہ اور بذریعہ شریعت اس کا اظہار۔ حضرت موسیٰؑ کی مسلسل جدوجہد کے طفیل اس طرح قومِ بنی اسرائیل اپنے اعلیٰ مقام کی طرف گامزن ہوئی۔ خلوص و وفا، ہمدردی، حِلم، پاکی و طہارت، تقوی و عبادت انکا شعار بنے۔ حضرت موسیٰؑ کا اپنی اُمت کی فلاح کے لئے بے پناہ جذبہ دیکھیں کہ ان کی روزمرہ زندگی کی فکروں میں اپنے فقر کی منازل تک کو قربان

کیا۔ بجائے اس کے کہ اللہ کی یاد اور اپنے مدارجِ قرب کی جانب لگتے انہیں یہ فکر کہیں زیادہ شدّت سے دامن گیر رہی کہ ان کی پرورش و رہائش، ان کے خورد و نوش، ان کی دینوی اور دینی اصلاح، خاطر خواہ ہوتی رہے۔ پیغمبر کے کام کا کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ نہ صرف یہ ہی بلکہ ان کی عاقبت بخیر کرنے کی فکر، ان کے ارتقائے باطن کی کوشش گویا ان کے اپنے معمولاتِ زندگی بن گئے۔ اُمت پر ان احسانات کو کسی میزان میں بھی تولا نہیں جا سکتا۔ زمانہ کو ایک نیا رُخ عطا کرنا، پہاڑوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر رکھ دینے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ ہدایت کی نئی روشنی کا اثر صرف اپنے ہی زمانہ تک محدود نہیں ہوا کرتا بلکہ نسلاً بعد نسلاً ایک گروہ انسانیت اسی بتلائی ہوئی راہ پر چلتا ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا ہے اس کی منزل بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ یہ کام نہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین سے ہوسکتا ہے بڑے نہ فاتحین سے۔ یہ کام نہ ملائک سے ہوسکتا ہے، نہ مخصوص عاشقوں سے۔ خالق و مخلوق کے درمیان رشتہ، پرونے کا کام صرف معصومین کے بے پناہ حوصلے اور غیب سے ان کی مستقل ہدایت کے ذریعہ ہی ممکن ہوا کرتا ہے۔ صرف دنیاوی سطح کے کام کو دیکھا جائے تو ایک خانماں برباد، مفلوک الحال، مظلوم و اسیر قوم کی نجات پھر اس کی آبادکاری، کوئی ایسا کام نہ تھا کہ ایک انسان یک و تنہا اس کو سرانجام دے سکتا۔ بغیر براہِ راست ہدایتِ ربّی کے اتنا بڑا کام کیسے سرانجام ہوتا۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں مہاجرین کی آبادکاری کوئی آسان کام بھی نہیں اور نہ ہی کہیں یہ مسائل حل ہو سکے ہیں۔ اب دیکھیں تو کتنا بڑا احسان ہے حضرت موسیٰؑ کا کہ اُمت کو غلامی، مظلومی اور استحصال سے بچایا۔ اور شہر کی مادّی دنیا، سبب اور نتیجہ میں گرفتار انسانیت کو یہ نظریہ بھی بخشا کہ مادّی وسائل سے پرے، ربوبیت اسی قادرِ مطلق کا کام ہے۔ چنانچہ قبیلہ در قبیلہ ان لوگوں کی آبادکاری کرا کے اللہ کی رحمت کے وسیلہ پر جینا سکھایا۔ ایمان کی پختگی کے لئے یہ بھی دکھا دیا گیا کہ غیب سے مخصوص انعامات۔ بادل، سایہ، پانی کے چشمے، من و سلویٰ، خوانِ نعمت بغیر مادّی وسیلوں کے اسی کی ربوبیت کی نشاں دہی کرتے ہیں۔ اب اس اُمت کو اور بعد میں آنے والے لوگوں کو چاہیے تھا کہ ان انعامات کی روشنی کو اپنی زندگیوں اور اپنی طلبِ حقیقت کے لئے مشعلِ راہ بنا لیتے۔ انسانیت کی لاج رکھنے کے بھی قابل اپنے کو بناتے تا کہ

معذور لوگوں یا گودی میں کھیلنے والے بچوں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ خوانِ نعمت سے ہی روزی کی بھیک نہ مانگتے۔ اس مفت خوری کو چھوڑ کر اپنی قوّتِ بازو پر بھی بھروسہ کرتے اور معبودِ حقیقی کے پیغام کے علمبردار بن کر زمانہ کو روشنی بخشتے۔ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر دنیا میں خلیفتہ اللہ کے مصداق بن کر زندگی گزارتے۔ اب یہی برباد قوم جسے حضرت موسیٰؑ کے طفیل، انسانیت میں فضیلت، شرف عطاء ہوا۔ اور حضرت موسیٰؑ کے بعد بھی ان میں نبیوں پر نبی بھیجے گئے۔ یہ سمجھنے لگی کہ اللہ کے مخصوص بندے یہی ہیں اور گویا اللہ بھی ان ہی پر انعامات و اکرامات کرنے اور ان ہی میں نبی بھیجنے پر مجبور ہے۔ ان کی ناشکری، ان کی خود پرستی نے انہیں اتنا مغرور اور ظالم کر دیا کہ راندۂ درگاہ ہوئے، معتوبِ بارگاہِ الٰہی ہوئے اور ایسے کہ رحمت العالمین تک ان سے ناخوش۔ یہ اسی لئے تھا کہ وہ اپنے علم، اپنے تقدس، اپنی جھوٹی اور ظاہری شریعت کی پابندی کے غرور میں نبیوں کو بھی جھٹلانے لگے۔ ان کے بدخواہ بنے، ان میں برائیاں نکالیں۔ ان پر تہمتیں لگائیں۔ ان کو قتل کیا۔ اور بالآخر ان کی خود پرستی، خود ستائش، ظلم، حسد، حرص، منافقت نے ان کو اسفل السافلین بنا دیا۔ جب انسان میں یہ منفی صفات گھر کر لیتی ہیں، تو نہ صرف ان کے قلب و روح بلکہ ان کی مادّی زندگی تک کو برباد کر ڈالتی ہیں۔ اسی لئے تو یہ جہنم کی آگ کہلاتی ہیں۔ صرف مادّی اور نفس کی سطح تک ہی دیکھیں کہ ان صفات کا حامل اپنی روزمرہ زندگی میں دماغی طور پر حسد، بغض، حرص، نفاق کی آگ میں کیسے کیسے جلتا رہتا ہے اور کچھ اس طرح کہ اس کی کتّوں کی سی خصلت ہو جاتی ہے اور اپنی نامرادی، ناکامی اور جلن کا بدلہ دوسرے عالمِ انسانیت سے لینے لگتا ہے اس کی مکر، فریب، دغا، نفرت، بغض، سے عالمِ انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ اس کے ذہن رسا کی پرکاریوں سے حقیقت کا چراغ تک ماند پڑنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دیکھا جائے تو گئو پرست اقوام میں برہمیت اور یہودیت، ایک اپنی خصوصی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنی نسل کا غرور، خدا کے منتخب بندوں میں اپنا شمار، عام انسانوں سے اپنی عظمت، مذہبی رسم و رواج کی سختی سے پابندی، اپنی عقل، اپنی دانش، اپنے علم پر اتنا ناز کہ انکی بیخ کنی کی جائے تو صدیاں ان جڑوں کو نکالنے میں لگ جائیں۔ نفس تو وہ عیار ہے کہ ایک نہ ایک معصوم صورت لے کر پھر سے راہ کھوٹی کرتا ہے، مادّیت، خود پرستی نفسانفسی

سے کب انسان کو نکلنے دیتا ہے۔ وہ سامری کا سونے کا بچھڑا اور گئو ماتا تو ایک بہانہ بنیں۔ جو بات ان اقوام کی گھٹی میں پڑ چکی تھی، جو نسلی طور پر ان کے لاشعور میں محفوظ تھی۔ اسی کو پھر سے ان کی زندگیوں میں عمل پیرا کرا دیا۔ زر پرستی، حرص، منفعت طلبی نے ایسا ان لوگوں کو لپیٹا ہے کہ آج بھی اس گائے کی پوجا، اقتصادیات کے پردہ میں ہو رہی ہے۔ نتیجتاً اسی توہّم باطل نے انسان کی نگاہ کو طلبِ حق سے ہٹا کر طلبِ زر کی طرف لگا دیا ہے۔ اس سامری کے بچھڑے کی عارضی چکا چوند نے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے۔ اس کی چنگھاڑ نے، مفلوک الحال انسانیت کو لرزہ براندام سا اور مفلوج سا کر دیا ہے۔ اس سحرِ سامری کو توڑنے، اس سونے کے بچھڑے کو زیرِ زمین کرنے کے لئے اسی ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے۔ اسی جلالتِ موسوی کی تلاش ہے۔

گائے کے پجاریوں کا آج بھی یہی حال ہے کہ ان کی تمام صلاحیتیں ان کا تمام زور اسی حرص و حسد پر صرف ہو رہا ہے کہ دوسرے انسان ان کے مقابلہ میں خوش حال و سرفراز نہ بنیں۔ اسی اندرونی کینہ کے سبب وہ دوسروں کو برباد کرنے کی فکر میں کچھ ایسے لگے کہ نبیوں کو بھی جھٹلایا، صحائفِ آسمانی کو بھی جھٹلایا۔ حالانکہ جس طرح ارتقائے انسانیت ہوا اسی طرح ارتقائے دین بھی لازمی تھا۔ اپنے ہی کو جب دوسروں سے سربلند نہ دکھا سکے تو دوسرے مذاہب کی تخریب کچھ اس طرزِ شیطنت سے چاہی کہ الامان۔ دوسروں کے مذہب کو اختیار کیا۔ تاکہ ان میں گھس کر ان کی تواریخ انکے تراجم و تفاسیر، ان کے علم تہذیب اور اخلاق کے خزینوں کو اپنے ذہن رسا کے ذریعہ کچھ اس لطیف انداز میں ضرب کاری لگا دیں کہ خود وہ قومیں اپنے ماضی سے بدظن ہو جائیں۔ یا کم از کم انہیں بے منفعت اور بے اثر سمجھنے لگیں۔ اس طرح ان لوگوں نے دوسرے عالم انسانیت کو روشنی کی بجائے ظلمت ہی بخشی۔ اور اپنی لعنت کا طوق دوسروں کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی۔ انصاف سے دیکھتے تو کیا صرف آلِ برہما اور آلِ یعقوبؑ کے لئے ہی یہ کائنات عالم پیدا کی گئی تھی! آخر حضرت یعقوبؑ سے پہلے کیا تھا؟ ایک ہی آدم کی اولاد میں یہ اونچ نیچ کیا۔ اللہ اور اس کے کام، اس کے فضل، اسکی ہدایت کو اتنا محدود کیوں سمجھنا کہ ایک مختصر گروہِ انسانیت ہی کے لئے ہو۔ اسکی رحمت تو عام ہے۔ روشنی،

باران رحمت، مومن، مشرک، نیک بد، سب پر ہے۔ اس کی ربوبیت تمام کائنات کا احاطہ کئے ہے۔ آخر شجرِ انسانیت میں شاخ بنی اسرائیل ہی تو بس درخت کہلانے کی مستحق نہ تھی۔ درخت کی دوسری شاخیں، اسکا تنا اس کی جڑیں بھی تو بہارِ انسانیت دکھا رہی ہیں۔ بس اسی تنگ نظری، خود پرستی، نفسانفسی نے اس قوم کو معتوب کیا۔ انہوں نے الوہیت کو بھی محدود و مجبور گردانا اور نبوت کو بھی صرف حضرت موسیٰؑ تک مقید کر لیا اس لئے ان کے علاوہ تمام پیغمبروں کو جھٹلایا۔ جس بات کی شیطان تک نے تاکید کر دی تھی وہی کیا۔ حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضرؑ کے علاوہ جب شیطان کے پاس بھی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو شیطان نے تعلیم دی تھی کہ من مگوتا ہمچو من نشوی۔ ''میں'' مت کہنا تا کہ کہیں مجھ جیسے نہ ہو جاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے اسی وسیلہ سے اس قوم میں خرابیاں آ گئیں اور لعنت میں گرفتار ہو گئی۔ یکطرفہ خود پرستی سے انکے نفس اور حریص ہو گئے۔ اور نسلاً بعد نسلاً کچھ ایسی شدت پکڑی کہ یہی بات انکے خون میں شامل ہو گئی۔ نفس کشی کے بغیر عاجزی، مسکینی، توکل کہاں ممکن ہو سکتا تھا۔ آخر حضرت موسیٰؑ کی طرح تنگی و تکالیف برداشت کرنا، صبر و شکر میں بے طلب زندگی گزارنا بھی تو سنت کی پیروی تھی۔ مگر یہ احسان فراموش قوم بجائے شکر گزار ہونے کے اور زیادہ حریص ہوتی گئی۔ دنیاوی ضروریات کی ہر چیز اور اپنے آرام و آسائش کا ہر روز نیا وسیلہ طلب کرتی رہی اور دین کے معاملات میں کچھ یہ سمجھ بیٹھی کہ بغیر مجاہدے اور ریاضتوں کے بھی انکو ہر قسم کے دینی مدارجِ اعلیٰ کا حقدار گردانا جائے۔

اب اس گروہِ انسانیت کی نجات اسی میں ہے کہ دینِ فطرت کے سادہ اصولوں کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھالیں۔ اپنی عقل و دانش، اپنے علم و فضیلت کے چکروں سے نکل کر ہدایتِ ربّی، علمِ لُدّنی، چھٹی حس کو پا جائیں جو فطرتِ انسانی میں ہے۔ اسی علمِ لُدّنی، اسی ہدایت من جانب اللہ کے طفیل وہ تمام جال جو سحرِ سامری نے عقل و فریب کے رنگ میں زمانہ میں پھیلا رکھے ہیں، بکھر جائیں گے۔ فطرت انسانی کی قدرتی شدّتِ کشادگی کے آگے مادّیت و نفس پرستی کے وہمِ باطل معدوم ہو جائیں گے۔ اعلیٰ اقدار و اوصاف انسان میں قدرتاً موجود ہیں۔ رحمتوں کی طلب سے شرعِ باطنی کے وہ خزینے مل جائیں گے۔ جن سے ہر انسان

نوازا گیا ہے۔ رحمتوں کے سائے تلے آ کر اپنے میں سے پھیل کر عالمِ انسانیت میں پھیلنے کا سبق لیں۔ اپنی محدود نظری کی بجائے، خالق کی نظر سے انسانیت کو دیکھیں۔ نفس کی منزل سے نکل کر لطیفۂ نفس کی تہذیب پانا گویا عبورِ دریائے نیل ہے۔ ان ہی منزلوں میں کرامتوں کے ظہور ہیں تا کہ طالبانِ حق ان کرامتوں سے روشنی تو لیں۔ مگر ان ہی کو آگے کے مقامات کے حصول کے لئے وسیلہ نہ بنائیں۔ آگے کا میدان، عشق وطریقتِ باطنی کا میدان ہے۔ جہاں محبوب کے لئے سب کچھ ہے۔ جہاں کی قدر میں ظواہرِ شریعت سے بلند ہو کر جانِ شریعت پر ہیں۔ محبّت وطریقت کا یہ وسیع میدان، وادی سینا ہے۔ معرفت کا پہاڑ، طور سینا ہے۔ اور رحمت کی آغوش، وہ وادی ہے جہاں آلِ اسمٰعیل خیمہ زن ہوئی۔ اور جس کا وعدہ معبودِ حقیقی نے اپنے مومن بندوں سے کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے قوم کے اسی ارتقائے روحانی کے لئے کوشش کی۔ گائے کی قربانی، تو نشانی تھی اپنے مشن کی تکمیل کی، باطنِ ملت کے ارتقاء کی ایک کڑی حضرت ابراہیمؑ کا دنبہ فرد اور خاندان کی سطح پر نشانی تھی، نفس سے لطیفۂ نفس تک ارتقاء کی۔ حضرت موسیٰؑ کی گائے کی قربانی نشاندہی کر رہی تھی اُمت کے لطیفۂ نفس سے مقام قلب کی جانب ارتقاء کی۔ پھر حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قربانی پیش کی۔ اٹھا لئے گئے۔ برزخ مابین قلب و روح پار ہوئی۔ اب عالم انسانیت کو اپنی طویل مسافت کے لئے دشتِ ہُو میں سفر کرنا تھا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی قربانی پیش کر کے، نشاندہی کر دی، ارتقائے باطنِ انسانیت کی۔ اس طرح دیکھا جائے تو منزل بہ منزل، دین کا روحانی ارتقاء ہوتا چلا گیا۔ ہر نبی کی شان کی رونمائی اپنے اپنے زمانے کی اُمت کی تصویر میں جلوہ گر ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں دینِ مبین اپنی پوری عظمت وجلالت کے ساتھ شرع و آئین کی صورت میں پیش ہوا اور انسانیت کا اگلا قدم عشق ومحبّت وطریقت کی راہ تک پہنچا۔

☆☆☆☆

باب ۵

عیسویؑ اسلام

حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ آیا تو رخ بدلا۔ اور یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس زمانہ تک دینِ موسوی کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، روح نکل چکی تھی۔ اب خدا کا قانون اس زمانے کے علماء کے نزدیک، لوگوں کو صرف سزا دینے کا ذریعہ رہ گیا تھا۔ حق شناسی کا جو فرض تھا اس کی طرف سے نظر ہٹ گئی۔ بہ الفاظِ دیگر قانونِ فطرت تک نظر سے الجھ کر رہ گئی اور مسبّب الاسباب سے لگاؤ، محبّت کا تعلق، رابطہ قائم کرنے تک کا خیال سرے سے ختم ہوا۔ قوم، سبب اور نتیجہ اپنے اعمال اور طلبِ جنت، اپنی کوششوں کے گھمنڈ اور عاقبت بخیر ہونے تک کے چکر میں ایسی پھنسی کہ تقدیر کا وہ پہلو نہ اپنا سکی جو حق کے انعام کے طور پر، حق سے لگاؤ کے طور پر برکت و رحمت بن کر نازل ہوتا ہے۔ یہ برکت اور رحمت ایسی چیز تھی کہ قوانینِ فطرت کے ذریعہ اس کی فہم نہیں ہوسکتی۔ یہ قوانین سے بالا چیز تھی اور یہی الرحمٰن الرحیم والی بات تھی۔ چنانچہ ظاہر بیّن قوم جس پر مَن وسلویٰ اترا تھا اب شرع کی پابندی تک ہی اپنی زندگی کو محدود کر کے بیٹھ رہی۔ دین کی راہ میں، حقیقت کی تلاش میں یہ انجماد کا باعث ہوا اور ارتقاء کے تقاضوں کے خلاف بھی۔ اس لئے قوم کی روحانی منازل میں فروغ کہاں سے ہوتا!

عالمِ انسانی کو فروغ اور تکمیل کی جانب ایک اور قدم آگے لے جانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ کا دورو ہوا۔ محبّت کے سایوں میں حق کی طرف رجوع ہونے کا پیغام عالمِ انسانیت تک پہنچا۔ حق کی پرستش کا دوسرا رخ اب انسانیت کے آگے پیش ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش حضرت آدمؑ کی طرح بن باپ کے ہوئی۔ گویا امرِ الٰہی کو قوانینِ فطرت سے بالاتر دکھانے کے لئے عالمِ انسانی کے آگے اس اعادے کی تاکید کی گئی ورنہ سبب اور نتیجہ میں گرفتار

دنیا مسبّب الاسباب کے وجود کو کیسے مانتی۔ اس پیدائش کے سلسلے میں فرمان جاری ہوا اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کو روح پاک سے نوازا جانا بھی اس بات کی دلیل تھی کہ ربوبیت کے ساتھ ساتھ اب محبّت نے بھی جنم لیا۔ انسانی زندگی کیلئے اور اسکے روحانی ارتقاء کیلئے روحِ پاک کی ضیاء ایک حرف کن کے مترادف تھی۔ جیسے ایک بجلی سی کوند جائے۔ بسم اللہ کی پہلی ٹھوکر سے چوتھے آسمان پر پہنچے، عشق میں قیام پائے۔ اناروحی پکار اٹھے۔ گہوارہ سے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا میں عیسیٰؑ ابن مریم ہوں۔ میں اللہ کا نبی ہوں۔ لوگوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کیلئے بی بی مریم بچّہ کو لیکر مصر چلی جاتی ہیں۔ وہاں حضرت عیسیٰؑ کا بچپن مسکینی، عاجزی، توکل میں پروان چڑھتا ہے۔ واپس بیت المقدس آتے ہیں تو لڑکپن بنی اسرائیلیوں میں حضرت ذکریاؑ کی سرپرستی میں گزرتا ہے۔ روح القدس سے نوازا ہوا بچّہ ایک پاکدامن، مظلوم و معصوم ماں اور ایک سنِ رسیدہ، رقیق القلب پیغمبر کی تربیّت میں حقیقتِ ذات کی طرف رجوع ہوتا ہے اب حال یہ ہوتا ہے کہ حقیقت ذات کے سلسلہ میں یا جن باتوں کو لوگوں نے بنیادِ دین سمجھ رکھا تھا۔ جب بھی حضرت عیسیٰؑ بات کرتے تو اچھے اچھے عالمانِ دین دنگ رہ جاتے۔ یہ اس لئے بھی کہ انہوں نے شریعت کو اپنے مادّی ذہنی جنجالوں میں پھنسا کر اپنے کو وارداتِ قلب، روح کے ارتقاء اور حقیقت سے بے بہرہ رکھا تھا۔ غریب و مظلوم انسانیت کے لئے حضرت عیسیٰؑ کا پیامِ نویدِ رحمت بن کر آیا۔ دین کے نام پر علمائے دین کی سختی، اور اپنی اہمیت کو عوام پر جتانے کے لئے گناہ، تقصیر، عذاب، جہنم، توبہ، استغفار میں گھیرائے رکھنا ایسا تھا، کہ قربِ الٰہی حاصل کرنے کی طرف قدم کہاں سے اٹھتے۔ اس طرح رحمتِ حق کا تخیّل ہی لوگوں کی زندگیوں سے اٹھ گیا۔ اب حضرت مسیح کے ذریعۂ جو رحمتِ عام کی خوش خبری، رحم و کرم، عفو و درگزر، لطف و اکرام کی نوید مخلوق کو ملی، تو لوگ جوق در جوق دین میں داخل ہونے لگے۔ دین کا نقشہ ہی بدل گیا۔ کاہنوں اور عالموں کو اپنا اقتدار ختم ہونا کب پسند آ سکتا تھا اس لئے مخالفت پر اتر آئے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ نے نفرت کا سبق سیکھا ہی نہ تھا۔ آپ نے غریبوں امیروں، سب پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ لوگوں کو اس طرح حق کی طرف رجوع کیا کہ وہ خود اپنا محاسبہ کر کے فیصلہ کریں

کہ راہِ حق کیا ہے۔ مادّیت اور نفس پرستی سے ہٹانے کے لئے آپ نے فرمایا ''ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا آسان ہے۔ یہ نسبت اس کے کہ امیر آدمی آسمانی بادشاہت میں داخل ہو''۔ اب ظاہر ہے کہ جسے خداوندِ حقیقی سے ملنے کیلئے آسمانی بادشاہت میں قدم رکھنے کا شوق ہو وہ خود اپنی زراندوزی سے تائب ہو کر حرص و ہوائے دولت چھوڑ دے گا اور اپنی باطنی صلاحیتوں کو تجسّس و محبّت کے ذریعہ اُجاگر کرے گا کہ خلوصِ عمل کی محرّک قوّتِ کُن یہی محبّت تو ہے۔ غریبوں سے محبّت و ہمدردی کا شدّت سے عیسوی اسلام میں سبق ہے اور غالباً اسی لئے لوگ تارک الدّنیا ہونے کی طرف رجوع ہو گئے۔ یہ بھی عقل کی دھوکہ دہی کا انداز تھا کہ یوں نہ بھٹکے تو یوں بھٹکا دیا۔ حالانکہ حضرت مسیحؑ کا نہ یہ خیال تھا نہ یہ مقصد کہ کاروبارِ جہان سرے ہی سے سرد پڑ جائیں اور سب خلقت اللہ کے گھروں میں یا گوشۂ تنہائی میں جا کر بیٹھ جائے۔ حضرت مسیحؑ کا انداز تو اس کے الٹ تھا۔ وہ تو شدّتِ محبّت میں بجائے خلقت کو چھوڑنے کے اس کی جانب شدّت سے رجوع تھے۔ یہ رجوع خود بخود تھا اور اس میں ایک بے ساختگی تھی۔ یہ رجوع حق اور حقیقت کی طرف تھا۔ اگر اس بات کو خلقت پکڑتی تو دنیا کے کام کرتے ہوئے بھی نظر مالک کی طرف رہتی اور اپنی ساری کی ساری کوشش اور توجہ دولت و جاہِ دنیوی حاصل کرنے میں صرف نہ ہوتی۔

حضرت عیسیٰؑ کا مچھیروں کے ساتھ خاص رابطہ رہا ہے۔ اس میں بھی رمز کی بات ہے۔ بحرِ حق میں مچھلی متلاشیٔ حق کی نشانی ہے اور مچھیرا، متلاشیانِ حق کا متلاشی ہادیٔ حق کی نشانی، جان جوکھوں میں ڈالتے ہوئے، زندگی کی تمام سختیاں صبر سے برداشت کرتے ہوئے، اپنی قوّتِ بازو پر عمل پیرا ہونا اور رحمتِ حق کے بے پایاں سمندر میں قناعت و توکّل کے جال ڈالنا عجب انداز ہے۔ اوپر وسعتِ آسمان، نیچے بحرِ بے کراں اور درمیان میں ایک حقیر و عاجز انسان۔ لیکن یہی تمام خداوندی شانوں کا آمر، یہی تمام مخلوق پر حاکم یہی تمام قدرت کے خزینوں کا مالک۔ اس کی ہر رنگ نئی آن، ہر روز نئی شان،

فبأیّ الاءِ رَبّکُما تُکَذِّبان ؕ

''کہاں تک اپنے رَب کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے''

پیامِ حق خلقت تک پہنچانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ نے قلندری اختیار کی۔ شہر شہر اور گاؤں گاؤں پھرے اور اس انداز میں کہ

ہر جا کہ می بری من بیچارہ می روم باشد عنان من بہ کف اختیار دوست

جہاں لیجاتا ہے میں بے چارہ جاتا ہوں میری لگام میرے دوست کے اختیار میں ہے

مسکینی و عاجزی کی یہ معصوم تصویر، آغوشِ عصمت میں پروان چڑھی، بچپن کا دنیاوی مضبوط سہارا جو باپ کی شکل میں ہر انسان کو میسر ہوتا ہے وہ بھی نہ تھا۔ مظلوم و معصوم ماں، اس دنیا میں یکہّ و تنہا، اپنے دامنِ عصمت کو غربت اور گوشہ نشینی میں گزار رہی تھی۔ یہ بھی عجب مفلوک الحالی اور یتیمی تھی کہ نام بھی باپ کی حیثیت سے لیا جائے تو کس کا۔ دنیوی سہارا ڈھونڈا جائے تو کس کا۔ بچپن اور لڑکپن کے آنسو اگر ڈھلک بھی آئیں تو کس کے دامن سے خشک کئے جائیں۔ اُدھر مادّی دنیا کی نفسانفسی میں سوائے میرے، تیرے کے کیا تھا! یہاں ایسے پا اُفتادہ اور جہان کے ٹھکرائے ہوئے کو اپناتا تو کون۔ اور جنہیں دنیوی رشتوں کی وجہ سے اپنا کہا جا سکے وہ یہ سوچتے تھے کہ بن باپ کی اولاد کو اپنا کہہ کر کہیں انکے دامن میں گناہ کی تہمت نہ لگ جائے۔ ساتھ دے تو کون۔ یہ لوگ تو اس کی معصوم ماں کو بھی عصیان و گناہ کی تہمت لگائے بیٹھے تھے۔ یہ دنیوی ننگ و ناموس کے دیکھنے والے عالمِ قدُس کے ناموس پر کیا نظر کرتے۔ غرض اسی عالم محرومی اور عالمِ صبر و مظلومی کی یکتائی میں بچپن، لڑکپن اور جوانی گزری۔ سوائے آسمانی باپ کے اس بطلِ حقیقت کی نظر اور کہاں جاتی۔ وہ دنیا جو سوائے مطلب، خود پرستی، جاہ و چشم کے دوسری چیز نہ جانتی تھی، اس معصوم ذات کو کیسے سینہ سے لگاتی۔ اب اس روح اللہ سے نوازے ہوئے کے لئے تنہائی کے آنسو اور خلقت میں لعن طعن اور پتھر کے سوا کیا تھا۔ عالمِ دین کب اُس کی سنتے کب اس کی بات جمنے دیتے۔ مگر وہ جس کی بنیاد، صبر پر قائم کی گئی ہو۔ کسی قسم کا حرفِ شکایت بھی کیسے زبان پر لاتا۔ اس کے وجود کی تو ایک

ایک لو، اور شعلہ ذات کی ایک ایک بھڑکتی دمک، اسے اپنے خدا اور مخلوقِ خدا سے ہم آہنگ کئے تھی۔ اسی لئے راتوں کی تاریکی اور دن کی روشنی میں اس نے خلقت کیلئے آنسو بہائے اور لعن طعن بھی گردن جھکا کر سنی۔ حرفِ شکایت یا بددعا تک کا تخیّل اسے نہ آیا۔ یہ نیّ معصوم و مظلوم، ننگے پاؤں، گاؤں گاؤں، بستی بستی، خدا کا پیغام لوگوں کو سناتا پھرا۔ مگر واہ رے خلقت کہ اسکی نگاہ میں یہ پیکرِ صبر و رضا اس بات کا بھی مستحق نہ تھا کہ کوئی اسے اپنے گھر ٹھہراتا۔ روٹی کا ٹکڑا اور پانی دیتا۔ وہ تو الٹا بے باپ کی اولاد کو نوازنا، گناہ سمجھتے رہے۔ وہ خود اپنے نزدیک تو اس سے کہیں زیادہ متدّین، پارسا، اور معصوم تھے۔ امیر اور دنیا دار کے پاس تو اسکی بات سننے کیلئے وقت ہی نہ تھا، نہ انکے پاس اسکی غربت پر رحم کھانے کی گنجائش تھی۔ البتہ کچھ عاجز و مسکین بندے ایسے بھی تھے جو، اس پر ترس کھا کر اسکی دیکھ بھال کرتے رہے۔ اس مظلوم وصابر کیلئے، صبر و مسکینی کا یہ ایک دن نہ تھا بلکہ برسوں اسی طرح اسکی زندگی گزرتی رہی۔ برسوں یہ بیمار و نحیف جسم، خون آلود پاؤں، زخم خوردہ بدن کے سہارے، گاؤں گاؤں پھر کر پیامِ حق سناتا رہا۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ حق بات پر گالیاں کھائیں، بدنی ایذائیں ملیں مگر شاکر رہا، خلقت کیلئے سوائے کلمہ خیر اور دعائے خیر کے زبان سے کچھ نہ نکلا۔ اس صبر و استقامت کی کیا انتہا۔ اگر تصوّر ہی میں ہم ایسا کر کے دیکھیں کہ جتنی کوئی اذّیت پہنچائے اتنا ہی اس کیلئے دعائیں نکلیں، تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ پھر یہ صبر تو وہ تھا کہ فطرت کی ساری قدرتیں ملی تھیں پھر بھی صبر تھا۔ وگرنہ وہ جسے اندھوں کو بینا کر دینے کی قدرت ملی ہو، جس نے کوڑھیوں کو شفا بخشی ہو، وہ جس نے مُردے زندہ کئے ہوں، اگر اس کی زبان سے بددعا نکل جائے یا اس کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھ جائیں تو کیا ہست نیست نہ ہو جائے۔ اور کیسی بددعا یا حرفِ شکایت، اگر اس کے دل میں تھوڑا سا میل بھی آ جائے تو کیا وہ قادرِ مطلق، وہ غیورّ، اپنے بندے کیلئے ظالموں کو تہ و بالا نہ کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے صبر اور استقامت کی مثال پیش کرنا، ایک بڑے دل جگر والے ہی کی بات ہے۔ یا مردئ مومن کی یہی نشانی ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہی خلقت جس کیلئے زندگی کی تمام تکالیف برداشت کیں، جس کیلئے راتوں کی نیند حرام کی، جس کے لئے زندگی کی تمام کاوشیں وقف کر

دیں، اپنے محسن کے احسان کا جو بدلہ دیتی ہے، وہ کیا ہے۔ پتھر، کانٹوں کا تاج اور سؤلی، صبر کا یہی انجام ہے۔ "وَاسْتَعِيْنُوْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوة" (اللہ کی مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ سے) کا یہی نقشہ ہے۔ "اِنَّا اللّٰه مَعَ الصّابِرين" (اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے) کی یہی تصویر ہے۔

صبر کا مقام، سکون کا مقام ہے۔ یہ دماغ، قلب اور روح میں توازن آ جانے کی بات ہے۔ جب اس طرح سکون مل گیا تو ایسے کو رحمت ڈھانپ لیتی ہے، حقیقت میں یہ رحمت **للعالمینؐ** سب کو لپیٹے ہوئے ہے۔ اسی لئے صبر و سکون ایک بے جان کیفیت نہیں ہے بلکہ محرکِ قوّت ہے۔ جتنا سمندر گہرا ہوتا ہے اتنا ہی سکون میں ہوتا ہے، اتنا ہی صابر، یہ سکون اپنے اندر اور باہر، کائنات کیساتھ ہم آہنگی کی کیفیت ہے اور یہی عجز کا مقام ہے۔ عجز بے پناہ قوّت ہے کیوں کہ سمندر بھی نچلی سطح پر ہونیکی وجہ سے اپنی بے پناہ طاقت رکھتا ہے۔ جو مردِ کامل سمندر کی طرح پرسکون ہو، اسی میں عاجزی آ سکتی ہے۔ عاجزی ہی وہ چیز ہے جو خدا کے پاس نہیں، اسی لئے اُسے پسند ہے۔ کبریائی صرف اللہ ہی کو زیب دیتی ہے۔ اسی لئے تکبّر انسان میں آ جائے تو معتوب ہو جاتا ہے۔ یہ عاجزی اور مسکینی ہی انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اسی کے ذریعہ قرب حاصل ہوسکتا ہے، اسکے علاوہ قرب کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ یوں دوسری چیزوں سے دوسرے مقامات حاصل ہو سکتے ہیں سوائے قُرب کے۔ صبر والے کی عاجزی، ذلّت والی بات نہیں بلکہ بڑی عزت اور دولت ہے۔ صبر کے ذریعہ ایک غیر بھی اپنے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور عجز کے ذریعہ قدرت کی وہ ساری نسبتیں، جو طبق در طبق اعلیٰ مقامات پر ہیں، انسان کو اپنے ساتھ ہم آہنگ کر لیتی ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ اگر عجز حُسن ہے تو صبر اس کا زیور اور زینت ہے۔ ایک صابر جس طرح دنیا سے کنارہ کشی کئے ہوتا ہے اور دنیا کی چیزوں سے بے پرواہ ہوتا ہے اُس سے دنیا والوں پر اس کی ہیبت حُسن طاری ہوتی ہے، صبر بے نیازی اور سکون والی بات ہے جس کا اثر دوسرے کے دل پر بھی ہوتا ہے۔ صابر کی یہ شان ہے کہ اس کا صبر خود بخود ماحول میں بھی پھیلنے لگتا ہے۔ صابر کو نہ شکایت ہوتی ہے اللہ سے، نہ مخلوق سے،

اور نہ مخلوق کو اس سے شکایت ہوتی ہے کیونکہ اس کا صبر ایک کشش، ایک جاذبیت لئے ہوتا ہے جس کو مخلوق بھی استحسان کی نظر سے دیکھتی ہے۔ چنانچہ صحیح معنوں میں جب صبر کیا جائے اور صفاتِ الٰہی کے انداز میں یہ صبر ہو، تو ماحول تک پر اس کا عجب اثر ہوتا ہے اور اسی لئے دوسرے انسانوں پر اس کے معجزانہ اثرات ہوتے ہیں۔ آخر کو تو، اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّابِرِین، ایک ٹھوس حقیقت ہے، صبر کا یہ رنگ سنّتِ الٰہی کے ساتھ صبر ہے۔ اور اسی میں ھُوَ الاوّلُ ھُوَ الآخِرُ کا راز ہے، یہ سبب اور نتیجہ سے اُوپر والی بات ہے اور رحمت و برکت و کرم کی طرح اونچے طبق پر ہے۔ صبر کی بات، عقل کی دنیا سے علیحدہ بات ہے جس کو قلب و رُوح سمجھتے ہیں اور عقل حیران رہتی ہے۔ صبر کی لذّت صابر سے پوچھیں۔ عجز کی عاجز سے اور مسکینی و قناعت کی ایک مسکین سے۔ یہ ہے عیسوئ، شریعت۔ یہ ہے رنگِ قلندرانہ اور قلندر کا انجام یہی ہے کہ قسمت میں تلخیاں بھی آتی ہیں تو بخوشی یہ کڑوے گھونٹ بھی پی لیتا ہے اور جب خون کے آنسو آنکھوں میں اُمنڈ آتے ہیں تو یہ انہیں اپنے وجود ہی میں جذب کر لیتا ہے۔ قلندر کے شوق کو نہ قیام ہے، نہ رکوع، نہ سجدہ، اسکی ایک منزل ہے بے نیل و مرام۔ نہ حاصل نہ حصول۔ قلندر مسکینی و عاجزی کی حقیقتِ دائمی میں ہوتا ہے۔ صبر کی زندہ تصویر، عشقِ خالق و مخلوق کی شدّتِ تحریک میں شوق کی وسعتوں میں، تاحدِ لا مکان سمایا ہوا، اسی قلندرانہ کیفیت میں اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ رسّی کا جیسے گلے میں پھندا ہو اور پاؤں اس طرح لٹک رہے ہوں کہ زمین پر لگتے بھی ہیں اور نہیں بھی، گویا قیام نہ آسمان میں نہ زمین میں، یہ روح اللہ کا مقام ہے۔ اور یہاں شدّتِ شوق کا یہ حال ہوتا ہے کہ مست و سرشار، محبّت کی وارفتگی میں ایک ہی کا ذکر، ایک ہی کی یاد اور ایک ہی کا رنگ اپنے اندر سمائے ہوتا ہے۔ خالقِ حقیقی کے انوار اب اسی مرکزِ حق سے مخلوق میں نشر ہونے لگتے ہیں۔ زیتون پہاڑ کے وعظ میں فرماتے ہیں!

''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، وہ جو غمگین ہیں، کیوں کہ تسلی پائیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو دل کے حلیم ہیں کیوں کہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔ مبارک ہیں وہ راست بازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں کیوں کہ وہ آسودہ ہوں گے۔ رحمدلوں پر رحم کیا جائے گا، پاک دل خدا کی زیارت سے شرف پائیں گے۔ اگر تمہیں میری وجہ سے ستایا جائے تو خوش

ہو اور خوشی کرو کیوں کہ آسمان پر تمہارے لئے بڑا انعام ہے۔ خون نہ کرو بھائی سے بے سبب خفا نہ ہو۔ قربان گاہ میں نذر لے جاتے ہو اور بھائی خفا ہے تو پہلے بھائی سے میل کرو۔ پھر نذر گزرانو۔ نہ صرف پڑوسی سے بلکہ دشمن سے بھی محبّت کرو۔ خیرات ایسے دو کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ جو لوگ تم سے کینہ رکھیں ان کا بھلا کرو، جو ستائیں اور دُکھ دیں اُن کیلئے دعا مانگو۔ خدا جو آسمان پر اپنا سورج، بدوں اور نیکوں دونوں کیلئے چمکاتا ہے۔ مینہ دونوں پر برساتا ہے۔''

یہ تھا اسلام کا وہ نمونہ جو حضرت عیسیٰؑ نے مقامِ عشق سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ گویا انسان کو رحمت کے سایوں میں زندگی کی اعلیٰ قدروں تک پہنچانا تھا۔ انسان کو قلب کی منازل، عشقِ الٰہی، عشقِ عالم میں پھیلا کر، اس بحرِ حقیقت کو عبور کرانا تھا۔ اب کہیں انسان قلب و رُوح کے درمیان حد پار کرنے کا اہل ہوا۔ رُوحِیُ مِنۡ رَّوۡحُ اللّٰہ کا مصداق ہوا۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مسکینی، عاجزی و غربت کو اسی رنگ میں اپنا کر عیسائیت کی معراج۔ سمجھی کہ رہبانیت کی راہ اختیار کر لی۔ دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ مکر و فریب، ظلم و استبداد لالچ ہوس میں گرفتار انسانیت کی نجات اسی میں سمجھی کہ نفس کشیٔ کی راہ اختیار کر لی جائے تا کہ سکونِ قلب و رُوح کسی طرح حاصل ہو اس تخیّل کے تحت نفس کشیٔ کے نئے نئے طریقے ظہور میں آئے، انسانی فطرت میں علیحدہ گوشہ تنہائی میں بیٹھنے کے قدرتی جذبہ کو بھی عمل پیرائی کا اس طرح یقیناً موقع ملا اور اس خود مسلط کردہ پرہیز گاری کی زندگی کا دوسروں پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا کیوں کہ انسانیّت کے آگے ایک آئیڈیل پیش ہوا کہ مسکینی، عاجزی، غربت پرہیز گاری، دنیا سے کنارہ کشی، انسانی ہمدردی، جذبۂ خدمت، صداقت، اخلاق، حیا اور یادِ خدا میں زندگی گزارنا اعلیٰ معیارِ زندگی ہے۔ شریعت سے ایک قدم آگے راہِ طریقت یہی ہے یہودیت نے صرف شرع کی سختی سے پابندی کو ذریعۂ نجات بنا کر ظاہر داری کی رسوم میں انسانیت کو پھنسا دیا تھا۔ عیسائیت نے تو انسان کی الوالعزمی کی یہ مثال بھی پیش کر دی تھی کہ انسان نے اپنی وحشیانہ نسلی جبلتوں کی معافی چاہنے میں سختیاں جھلیں،

حال اور دنیوی زندگی کو خراب کیا تا کہ عاقبت میں مستقبل اچھا ہو۔ اپنے اس عمل پر انہوں نے اللہ کا شکر بھی ادا کیا کہ اس نے یہ قوت عطاء کی کہ ان خوشیوں کو بھی جو حلال تھیں اور نصیب میں ہو سکتی تھیں آخرت کی طلب میں خود ہی چھوڑ دیا۔ اس جذبہ کے تحت انسان نے اپنے تخیّل، اپنے حوصلوں میں آزاد رہ کر مکان و زمان کی ان بیرونی قوّتوں سے نجات حاصل کر لی جن کے آگے انسان کو جھکنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ موت تک سے یک گونہ نجات کی راہ کھل گئی۔ عشقِ مسیح علیہ السلام اور ایمان کی اس روشنی اور سچّائی کی اس استقامت کو لئے یہ حق رسیدہ انسان اٹھے تا کہ شکستہ حال انسانیّت کو محبّت اور ایمان کی روشنی دے سکیں۔

لیکن غایت نظر سے دیکھیں تو دنیا سے کنارہ کشی، نجات کی تلاش، خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اپنے میں خرابی اور گناہ موجود ہے۔ یا گناہوں سے دو بدُو ہو کر ان ہی میں آلودہ ہو جانے کا اپنے وجود سے خطرہ ہے۔ عالمِ امکان میں انسان کی افضیلت ہوتے ہوئے بھی یہ شکست تسلیم کر لینا اور راہِ گریز اختیار کرنا ہرگز حضرت عیسیٰؑ کا پیغام نہ تھا۔ یہ مرُ دہ کیفیتّ میں راضی بہ رضا رہنا تو کوئی بات نہ ہوئی! زندگی کا یہ منفی انداز تو ہرگز حضرت عیسیٰؑ کا انداز نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے تو اپنی تمام عمر باطل کی اُن قوّتوں کے خلاف جہاد کیا جو انسان کے باطن کو عروج کی طرف مائل ہونے سے روکتی ہیں۔ آپ نے ایک جگہ بیٹھ کر گوشہ نشینی اختیار نہیں کی بلکہ جذب وشوق کی تصویر بن کر قلندرانہ شدّت میں گاؤں گاؤں اللہ کا کلام سناتے پھرے۔ عالم انسانیّت میں خود جا کر بیماری، افلاس، ناامیدی، ناکامی، پست حوصلگی، ضیعف الایمانی، اللہ کی ذات میں بھروسہ کی کمی کے خلاف جنگ کی شکست خوردہ انسانیت یعنی قومِ بنی اسرائیل کو ایک نئی روشنیِ امید و حیات کی عطاء کی۔ یہ حیات جسم کی حیات نہ تھی بلکہ ان اعلیٰ اقدار کی جو شرف انسانیت ہیں۔ یہ تھا رضی اللہ عنہ کا مقام۔ یہ تھا اپنے رب کو رحیم کریم سمجھنے کا انداز۔ یہ تھا فضیلتِ انسانیّت کا رنگ۔ کیسا خواہشات ترک کرنے اور دنیا سے دامن کشی کے الجھاؤوں میں الجھنا، یا دنیا کی آلودگیوں سے بچنے اور بچانے کی فکر میں لگے رہنا اس قسم کا تخیّل تو مشیتِ الٰہی میں خرابی کے وجود کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہوتا۔ یا اپنی مرضی کے مطابق کائنات عالم کے کاروبار نہ چلنے پر پیچ و تاب میں پڑ جانے یا عالمِ انسانیّت کو بُرا بھلا کہنے اور

سرزنش کرتے رہنے میں قوّت ضائع کرنے کے برابر ہوتا۔ حقیقت بینی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یادِ خدا اور تسلیم و رضا کا وہ رنگ جمتا کہ منکرات سے بھاگنے کی بجائے یا ان سے اثر پذیر ہونے کی بجائے، محبوب حقیقی کے ذکر اور عملِ مثبت کا انداز قائم کر کے پامردی مومن کا ثبوت دے دیا جاتا۔ یہی کچھ حضرت عیسیٰؑ نے کیا کہ آپ نے خدائے رحیم و کریم کو دنیا کے آگے اسی انداز میں پیش کیا کہ اسکا ہر کام مصلحت و رحمت سے خالی نظر نہ آئے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی یہی فوقیت شرعِ موسوی پر ہے کہ منکرات سے گریز مقصود نہیں بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اپنے کو ان چیزوں سے بچائے رکھنا ہے جو آلائشِ رُوح کا سبب بن سکتی ہیں۔ دنیا سے گریز تو شکست خوردہ ذہنیت کی نشانی ہوتی۔ پامردی کی یہی بات تھی کہ تمام نچلی اقدارِ زندگی سے دو چار ہو کر بھی نہ ان کا اپنے پر اثر لینا تھا نہ ان میں گھر جانا بلکہ ایک اس سطح کی بے نیازی اور فتح حاصل کرنی تھی کہ دنیا پاؤں تلے رہے اور گویا پانی میں ہوتے ہوئے بھی دامن تر نہ ہوا۔ اس فتح النفس کے بعد مقامِ قلب میں قیام پانا تھا جو عیسوی عشق و دین کی جان ہے۔ پھر نفس و قلب کی توحید میں اپنی تمام صلاحیتوں کی میزان میں مقامِ روح کی طرف گامزن ہو کر رُوحِ منِ روح اللہ کا انداز نکھرنا تھا۔ اور اس عالمِ آب و گل میں عمل صالح کا ایک نیا رنگ جمانا تھا جس کے ذریعہ زندگی طیبّہ ہو جائے اور ماضی، حال، مستقبل ایک ہی توحیدی رنگ میں ہو جائیں۔ کیوں کہ جب تک زمان و مکان سے عشق کی یکتائی توحید میں اس طرح ہم آہنگی حاصل نہیں ہو جاتی اس وقت تک نہ مجرّد ات کی فہم حاصل ہو سکتی ہے، نہ عرفانِ حقیقت نصیب ہو سکتا ہے۔ یہ عرفان ادھر ہی سے ہے اور فنا کے بعد راضی بہ رضا رہنے کے بعد ہی اس کا ظہور اپنے میں ہے۔ یہ اپنے بس کی بات نہیں بلکہ عطا ہے، کیوں کہ تنکے جمع کرنے سے بہار نہیں آتی بلکہ بہار آئے تو آشیانے خود بننے لگتے ہیں۔ عبودیت کا یہی مقام ہے جس کی طرف اسلام شدّت سے نشان دہی کر رہا ہے۔ یہ توازن میں آ جانے کی بات ہے۔ اس وقت ہر بات کا شعور ہوتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ پتہ نہیں ہوتا کہ زمان اپنے میں ہے یا آپ زمان میں۔ توحید کے اس انداز میں رحمت کے سایوں میں رسائی ہوئی ہے۔ نفس اپنی خود پرستی سے نجات حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ مُوتُو قَبلَ اَنتَ مُوتُو کی منزل نصیب ہو چکی ہوتی ہے۔ عشقِ

جمعیّت کے رنگ میں قلب میں قیام نصیب ہو جاتا ہے۔ نفس کو ختم کرنا بے معنی بات تھی۔ اب نفس کو بھی عشقِ جمعیّت کے وسیع میدان میں تہذیب مل کر، آگے قلب کی اقلیم میں ہم آہنگی نصیب ہو چکی ہوتی ہے۔ اس سے ایک قدم آگے جب اسلام قولِ فیصل میں داخل ہو کر **رحمت اللعالمینؐ** دامن نصیب ہوتا ہے تو روح اور عالمِ امر سے رابطہ ہوتا ہے۔ کاروبار جہان میں حصہ لینے کے لئے اب اور زیادہ صلاحیتیں اُجاگر ہو چکی ہوتی ہیں۔ کیسی مُنکرات سے دامن بچائے رکھنے کی فکر، کیسی گریز اور فرار کی مُردہ اور منفی کیفیّات اب تو عشق کی صلاحیت کے طفیل عالمِ امر سے رابطہ قائم ہو کر زندگی عالم کو ایک نیا فروغ بخشتا ہوتا ہے۔ یہی حقیقی معنوں میں جانِ اسلام ہے کہ ایسے کو ایک طرف اپنے باطن میں، نفس، قلب، روح کی میزان حاصل ہو چکی ہوتی ہے اور دوسری طرف ظاہر میں عالمِ انسانیّت اور کائنات سے ہم آہنگی۔ اب زندگی اپنے اس توازن میں اعلیٰ معیار اور اعلیٰ اقدار کی طرف گام زن ہوتی ہے۔ حق کا متلاشی دنیا میں رہتے ہوئے بھی یادِ خدا سے غافل نہیں ہوتا۔ اس کا ہر کام اللہ کیلئے ہوتا ہے۔ ایسی حالت اور فکر و عمل کی اس شدّت میں اب تمام آلائشِ جہان بھی اس کا دامن آلودہ نہیں کر سکتیں۔ وہ مادہ میں ہوتے ہوئے اپنی مادّی سطح سے اُوپر ان لطافتوں میں جی رہا ہوتا ہے جن سے قلب کی دنیا آباد ہے۔ یہی اس کی فتح ہے نفس اور مادّیت پر۔ اب وہ زندگی کی تمام نچلی سطح کی پابندیوں سے اپنے کو بے نیاز اور آزاد سمجھتا ہے۔ نظر مرکزِ عشق پر جمی ہوتی ہے اور حیات کا ایک نیا مزہ آتا ہے۔ جو قدریں زندہ اور پائیدار رہنے کے لائق تھیں وہ اپنے وجود کی استجارۃً فنا ہونے کے بعد بھی زندگی کے فروغ کو قائم رکھتی ہیں۔ اس طرح حیّ و قیومؐ انوار ایسے وجودوں سے نشر ہو کر کائناتِ عالم کو محیط کئے ہوتے ہیں۔ قلب کی دنیا اور اس کی لطافتیں ایک عاشق کو ہی نصیب ہوتی ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں زندگی کی قدروں کو ایک نیا رخ، ایک نیا کیف و جذبہ اور نیا حُسن و جمال نصیب ہوتا ہے۔ یہیں سے قلب و رُوح کی درمیانی منزل پار ہوتی ہے۔ فیضانِ نظر سے اب انسان اپنی اور کائنات کی زندگی کو ایک نئی شکل میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس جگہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قلب و روح کے درمیان حد پار کرنے پر چہروں کی قدریں کیوں بدل جاتی ہیں۔ اسکو آئینہ کی مثال سے اچھی طرح سمجھایا جا سکتا ہے۔ آئینہ

میں نہ صرف یہ کہ بایاں، دایاں ہو کر ظاہر ہوتا ہے، بلکہ گھڑی کی سوئیوں کا مخالف گھماؤ، گھڑی کے مطابق گھماؤ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اسی لئے جب بھی کوئی اپنے کو آئینہ حق میں دیکھے تو چیزیں اپنی اصل حقیقت میں نظر آئیں، اگرچہ اس دنیا میں یہ کسی اور صورت میں نظر آتی ہیں جب بہ فضلِ ربّی قلب و روح کے درمیان حد پار ہوتی ہے تو فکر و نظر میں بھی اسی طرح تبدیلی آتی ہے۔ جب تک انسان کی نظر صرف دنیاوی قوانین اور عام اصول زندگی پر لگی رہتی ہے تو دولت کمانا، علم و ہنر حاصل کرنا، جان بچانا، اقتدار حاصل کرنا، اپنی ذات پر خرچ کرنا، مستقبل کیلئے پس انداز کرنا، عاقبت کی فکر کرنا وغیرہ اس کا معیار حیات ہوتے ہیں۔ شریعت بھی ان چیزوں کی اجازت دیتی ہے۔ مگر اسلام کے عیسوی مقام پر آ کر نظریۂ حیات دوسرا ہی رُخ اختیار کرتا ہے۔ اب نظر ان قوانینِ فطرت کے صحیح پہلو دیکھتی ہے ان کے پیچھے کسی اور کی کرم فرمائی دیکھتی ہے۔ یہ رمز اسی پر آشکار ہوتا ہے جسے مرکز عشق مل گیا ہو، جس کے دل کی کھڑکی کھل گئی ہو، جس نے عشق کی دنیا میں قیام پا لیا ہو۔ یہاں ہر فرد کی زندگی میں ایک تابندگی آ جاتی ہے اور اس کے اندر وہ صلاحیتیں خود بخود جاگنے لگتی ہیں جو زندگی کا حقیقی حُسن کہلا سکتی ہیں، مثلاً دولت کی جگہ فقر و غنا، اپنی شان جمانے کی جگہ مسکینی، اپنی نفسانفسی کی جگہ جذبۂ خدمت، قربانی، اپنے فروغ کی جگہ امت کا فروغ۔ یہاں تک کہ اپنی عاقبت کی جگہ اُمت کی عاقبت اور کسی قسمِ کے اعلیٰ اقدار گھر کر لیتے ہیں۔ اب ایسی حالت ہوتی ہے جیسے کہ سکۂ دوسرا رُخ پلٹ گیا ہو۔ یا آئینہ سامنے آ گیا اور بایاں دایاں ہو گیا ہو۔ اب گویا اپنا حقیقی حُسن نکھرا۔ پہلے محبوب کو پردہ کے پیچھے سمجھتے تھے۔ اب آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ ہوا تو زندگی نے نرالا رنگ اختیار کیا۔ جان بچانا شریعت اور عقل دونوں کے مطابق ضروری تھا۔ اب پروانہ وار محبوب کے نام پر فدا ہو کر، شہادت حاصل کر لینا محبّت کی دنیا میں مقبول ترین عمل بنا۔ اس عمل میں ایک نمودِ شوق تھا، ایک بے ساختگی تھی۔ یہی حال خدمتِ خلق، صدقات و زکواۃ کا ہوا کہ انکی جگہ سخاوت، امانت، قناعت، محبّت توکل، تقویٰ، احسان نے لے لی۔ شرعی حدود تک ان کا خاص معیار کافی سمجھا جاتا تھا۔ مگر محبّت کی دنیا میں ان کی حدیں بے پایان ہو گئیں۔ یہی حال یادِ الٰہی کا ہوا کہ شریعت کے تقاضوں میں تو مقررہ اوقات میں فرض کی ادائیگی تھی، مگر محبّت کی

دنیا میں طالب کارواں رواں ذاکر ہر دم شاغل دیکھا جائے تو یہ صفات حمیدہ انسان کی خود اختیار کردہ صفات ہیں جن کی فطری صلاحیت حق تعالےٰ نے اُسے بخشی ہے۔ ان اعمال کا تعلق نیت وخلوص سے ہے صداقت سے ہے، محبّت سے ہے حقیقت آشنائی سے ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کہاں ایک محبّت کرنیوالے کا عمل جو وہ اپنے محبوب کے لئے خود بخود کرتا ہے اور کہاں ایک خادم کی اطاعت شعاری جو وہ صرف ایک حکم بجالانے کی خاطر، خواہ کتنے ہی حُسنِ قابلیت سے کرتا ہے۔ پرستش اور حمد وثناء تو اس خدا کی تھی جسے اپنی مخلوق سے بے پناہ محبّت ہے اور اس لئے کہ یہ خلقت ہی تو اس کے اپنے شوقِ خودنمائی کو پورا کر رہی ہے۔ اس رحیم و کریم کے الطاف دیکھیں جو ہماری زندگیوں میں ہر آن اس کی طرف سے ہو رہے ہیں اور جن کی تصدیق خود ہمارا وجود کر رہا ہے۔ پھر اپنے اس عمل کو دیکھیں جسے ہم عبادت کہتے ہیں تو معیارِ انسانیت سے کس قدر گرا ہوا ہم اپنے کو پاتے ہیں۔ جزا سزا کے خیال سے یا فرض پورا کر لینے کی توفیق کی سطح تک، کیا عبادت۔ جب محبّت کا پرتو نہ ہوا، جب لگن اور وفا سے حق کی طرف رجوع نہ ہوئے تو کیا عبادت۔ جب اسکے عظیم احسانات دیکھ کر بھی اس کے آگے سجدہ ریز نہ ہوئے تو کیا بندگی کا دعویٰ، کیا زہد وتقویٰ کا دعوی، محبّت والے کے ہر عمل میں تو لگاؤ ہوتا ہے، خلوص ہوتا ہے، احسان ہوتا ہے احسان ایمان کا دوسرا انداز ہے جو اُحسن ہے مقبول ہے محبّت کے رنگ میں ہے۔ جاننا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا زمانہ ہی کیا، کوئی زمانہ ہو جب تک کہ اپنے رب کو خوفِ جزا سزا یا عاقبت جنت کی سطح سے اوپر اٹھ کر نہ مانا تو نہ انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک رسائی ہو سکے گی، نہ ہی حقیقت شناسی نصیب ہوگی۔ جب بیشتر عالمِ انسانی کا ایمان، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر ہے تو پھر اس کے محبّت کے الطاف کو سمجھ کر اس کی جانب احسان وتشکر میں سجدہ ریز کیوں نہیں ہوتے۔ رحمت کے دروازے تب ہی تو کھلیں گے۔ حضرت عیسیٰؑ نے عالمِ انسانیت کو ان ہی رحمت کے دروازوں کی طرف پھیرا۔ لیکن انکی شریعت کے ٹھیکیداروں نے دین کی آڑ لیکر شرک وکفر کے فتوے دیئے کلمہء کفر کی سزا موسوی شریعتِ بنی اسرائیل میں موت تھی۔ اب وہی مسکین، عاجز، محبّت سے بھرپور نبی، جس نے بیماروں کو اچھا کیا، اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کیا، مُردوں کو زندہ کیا وہی مسیحا اب تختۂ دار پر چڑھانے

کے قابل ہو گیا۔ وہ جس کیلئے کلمتہ اللہ، روح اللہ فرمایا تھا یعنی کُن کا مصداق۔ وہ جس کی اپنی پیدائش تک کُن کے انداز میں ہوئی تھی (کہ قلب و روح کے مقام پر پیدائش کُن کے انداز ہی میں ہوتی ہے) اب شریعت کے محافظوں کے آگے واجب الدار قرار دیا گیا۔ علما کے قلوب کیسے زنگ آلود ہو گئے تھے۔ حالانکہ سب کو دین کی پابندی کا نہ صرف دعوی بلکہ گھمنڈ تھا اور وہ بھی اس حد تک کہ دین کی فہم و دانش کو ان لوگوں نے صرف اپنے لئے مخصوص سمجھ رکھا تھا۔ اب ان ہی نام نہاد دین داروں کے قلوب پتھر کی طرح اس ظاہر داری کی رسومِ شریعت سے سخت ہو چکے تھے وہ ہدایت و عرفان سے محروم تھے۔

☆☆☆☆

باب ۶

نزولِ رحمت، رَحمتُ اِلّلعَالَمینؐ

حضرت عیسیٰؑ کے پیغام سے ایک نئی راہ عالم انسانیّت کیلئے امیدوں کی روشنی کی کھلی، اب تک عالمِ انسانیت عذاب ثواب کے چکر میں گرفتار تھی، مگر اب عشق کے سہارے، حقیقت عیسوی تک رہنمائی ملی اور آگے کی منازلِ حقیقت کی طرف عروج کی راہ کھلی۔ اب وہ لوگ جو دین کی سختیوں سے گھبرائے ہوئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی طرف رجوع ہو چکے تھے۔ انجیلِ مقدس کے الفاظ اِن کے لئے مشعلِ راہ بن چکے تھے۔ شریعتِ دین کی سختیوں سے چھٹکارا حاصل ہونے کیلئے انہوں نے سمجھا کہ شائد پچھلے صحیفے منسوخ ہو گئے۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تم یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک لفظ یا ایک شوشہ توریت کا ہرگز نہ ٹلے گا، جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔ ''اس طرح آپ نے ارتقائے دین کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ پیغامِ الٰہی کے زینہ بزینہ تکمیل منازل کی طرف جانے کا اشارہ تھا۔ آگے چل کر دین کی تکمیل ہونی تھی۔ چنانچہ یہ سلسلہ مختلف آسمانی کتب اور زبور، توریت، انجیل کی صورت میں جاری رہ کر قرآن کریم پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ قرآن نازل ہوا تو اس نے نہ صرف انبیاء کی تصدیق کی بلکہ انکے پیغامات کی بھی۔ یہاں تک کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُم (فرما کر دین کی تکمیل اور عالمِ انسانیت پر احسان ختم کر دیا) اسی کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی کہ توریت کا لفظ یا شوشہ اس وقت تک نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو جائے۔ خود قرآن پاک کا ارشاد ہے کہ ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بدلتے ہیں تو اس جیسی آیت لے آتے ہیں یا اس سے بہتر۔ اس طرح قرآن دوسرے صحیفوں کی تصدیق ہی کرتا ہے اور محبّت کے پیام کے علاوہ، شریعت کے اصول، اصولِ

بندگی، اصولِ زندگی کی وضاحت کرتا ہے۔ بیشتر انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات نصیحت اور عبرت کے طور پر قرآن کریم میں مذکور ہیں اور ارتقائے دین کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام نے تمام ادیان کی تصدیق کی، خصوصی طور سے دین ابراہیمیؑ، دینِ موسویؑ اور دینِ عیسوٰیؑ کی اور اپنے مخصوص انداز میں دونوں کی تکمیل بھی کر دی۔ ساتھ ہی ان کے درمیان میزان قائم کر دی جو عروجِ انسانیت کی دلیل ہے۔ اس میزان کا نصاب عالم امر ہے۔ کُن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے فقہا، علماء کی نظر عالمِ امر پر نہ گئی سوائے عمل عملیات، ورد و ظائف کے۔ انہوں نے محبّت والے پہلو تک کو یکسر نظر انداز کر کے صرف لطیفۂ نفس کی سطح پر شرع کی وضاحت کی ہے۔ مقامات روح و قلب میں بغیر نسبت محمدیؐ کے رسائی نہیں ہوسکتی۔ نہ ہی حقیقت سے رابطہ قائم ہوسکتا۔ حضور نبی کریمؐ کا وجودِ گرامی تو کائناتِ عالم میں اس طور پر جلوہ گر ہوا ہے کہ نہ آپ سے پہلے کوئی ایسا ہوا، اور نہ بعد میں ہونے کی گنجائش ہے۔ ''لَوْلَاکَ لَمَاخَلَقْتَ الْاَفْلَاک'' (تم نہ ہوتے تو افلاک نہ ہوتے) اس حقیقت کا انکشاف کر رہا کہ اس تخلیق عالم میں صرف ایک ہی، ہستی مظہر بالذات وصفات ہوسکتی ہے اور وہ آپؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ نورِ محمدیؐ سلسلۂ جاریہ ہے۔ اسکی جلوہ فشانی سے اس کائنات کی زندگی اور حُسن ہے۔ یہی باطنِ تخلیق ہے۔ اس جگہ اس کی تشریح کرنا مقصود نہیں۔ باطن تک جن کی رسائی ہے وہ خود اس نکتہ کو پا جاتے ہیں اسی کا تو سبب تھا جو حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی ہے کہ میری اولاد میں سے ایسا نبی پیدا کر فرمایئے۔ جو لوگوں کو آپ کی آیتیں سنایا کرے، ہدایت دے اور قلوب کا تصفیہ کرے۔ اسی کی بشارت اپنے اپنے زمانے میں مختلف مرسلین اور حضرت موسیٰؑ، عیسیٰؑ، یحییٰؑ دے چکے تھے۔ اسکے باوجود اب تک مختلف مذاہب کے لوگ اسی ضد پر اڑے ہیں کہ ہدایت ان ہی کیلئے ہے۔ مرسلین اور صحائف ان ہی پر نازل ہوں گے۔ وہ نبیٔ موعود ان ہی میں آئے گا۔ وعدۂ خداوندی پورا ہو چکا ہے ان ہی کے بھائیوں، نبی اسمٰعیل میں حضور نبی کریمؐ تشریف لا چکے دین کی تکمیل ہو چکی۔ یہود اب تک انتظار میں ہیں۔ حالانکہ وہ نوید جو انکی کتابوں میں ہے پوری بھی ہو چکی ہے۔ مسیحؑ بھی آ چکے اور حضور نبی کریمؐ بھی۔ دین اب قلب و روح کی منازل طے کر کے، توحیدِ ذات میں بھی پہنچ

چکا۔ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا جیسا کہ قرآن سے ظاہر ہے اور دین کا ایک مثالی نقشہ، اسلام کے ابتدائی چالیس سالہ دور میں دکھایا بھی جا چکا۔ عالم انسانیت کو اب خواستہ نا خواشتہ یہی راہ اختیار کرنی ہے۔

حضور نبی کریمؐ کی پیدائش کے وقت جو انوار کا نزول ہوا، اسی سے دنیا کے دور دراز حصوں میں یہودی اور عیسائی راہبوں میں سے کچھ نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ موعود تشریف لے آیا۔

ہوئی آمنہ کے بطن سے ہویدا دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

حضور اکرمؐ کی ابتدائی عمر، ماں باپ کی شفقت سے محرومی اور یتیمی میں گزری۔ اپنے اور خلقت کے درمیان اس وسیلے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس بچّہ کو خود اعتمادّی میں، اپنی میزان آپ بنتے ہوئے بڑھنا تھا تا کہ خلقت کی رہنمائی کر سکے بچپن میں پیشہ چوپانی اختیار کیا۔ جو انبیائے سابقین میں سے بہت سوں نے کیا تھا۔ اپنے مویشیوں کی دیکھ بھال کا سبق، اپنی امت کی نگہبانی مستحکم کرنے کی نشانی تھی۔ یہیں کشفِ صدر ہوا، قلب انوار سے پُر ہوا۔ پھر جوانی میں دور دراز ملکوں کا سفر، مخلوقِ عالم سے رابطہ اور نورِ محمدیؐ کی مخلوق پر تجلی کی نشان دہی کر دی گئی۔ رحمت اللعالمینؐ انوار کے عین بموجب بات تھی۔ مخلوق سے اس قسم کے لگاؤ میں دیانت، امانت، صداقت، مروت، محبّت، سخاوت کا انشراح ہو رہا تھا۔ پھر عروجِ خودی کیلئے ضروری تھا کہ غارِ حرا کی تنہائیوں میں اس حقیقت سے رابطہ ہو۔ جس کی تجلی حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو اپنے اپنے زمانہ میں ملتی رہی۔ غارِ حرا کی سنت محمدیؐ۔ اپنے باطن کی گہرائیوں میں غوطہ زنی اور جذب کی حالت میں پوری کی جا سکتی ہے۔ یہ وہ سنت ہے جو چالیس سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل، نبوت عطاء ہونے سے قبل حضورؐ نے فرمائی تھی۔ اسی سنت کے انوار کی تجلی اب تک غارِ حرا میں جاری و ساری ہے۔ اسی ایوان میں آج تک قطب، غوث، ابدال، خلافتِ ارضی کو میزان میں رکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، غارِ حرا میں جن تجلیاتِ باطنی کا نزول، وجودِ اطہر پر ہوا اسکا اعلان بالآخر پیامِ الٰہی اِقْرَا بِاسْمِ رَبِّک (پڑھ اپنے اللہ کے نام پر) کی صورت میں ہوا۔ حرا کا نورِ باطن فاران کی چوٹی پر جلوہ ظہور

کی تابانی لیکر چمکا اور تاریخ شاہد ہے کہ ایک نے نہ جھٹلایا۔ یہی اسکے نبیٔ موعود ہونے کی دلیل تھی۔ یہی اس کے صادق الوعد الامین ہونے کی سند تھی۔ پیامِ رحمت، نویدِ حیات لیکر پھیلا اور تائیدِ ربانی کا سایہ اس کے قدم قدم پر تھا۔ امر خداوندی کے اس شان سے اظہار کی مثال تاریخِ انسانی میں کسی نبی یا پیغمبر کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ یہ امر باللہ انسانی زندگی کے ظاہر کو بھی سنوار گیا اور باطنی حُسن کو بھی۔ اس نے حُسنِ جمعیّت کی صورت میں دنیا کے آگے پیش کیا۔ اسکے بعد یہ حُسنِ جمعیّت خود ایک رحمت بن کر دنیا میں پھیلا، اور ظاہر باطن دونوں کی میزان میں لوگوں کو سنوار گیا، رہتی دنیا تک، عالمِ انسانیت کو ایک پیام اس انداز میں پہنچا دی گیا کہ اے خدا یہ لوگ تو گواہ ہیں ہی تو بھی گواہ رہنا کہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔ یہ مقبولیت نہ کسی نبی کو نصیب ہوئی، نہ اب اس کی گنجائش ہے۔

نبیِ کریمؐ کی زندگی سراپا حلم و خلُق کا نمونہ تھی۔ آپؐ نے فرمایا میری بعثت اسی لئے ہوئی ہے کہ میں اخلاق کو لوگوں تک پہنچا دوں۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا میں اس وقت نبی تھا۔ جب آدمؑ ابھی مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔ اسطرح آپ نے عالمِ اجسام اور اسکی تمام واردات نفس و قلب سے پرے اپنا قیام عالمِ روح کی انتہائی منازل سے بھی پرے، غیب کے اس پار، دُھوئیں بتایا۔ یہ بات آپؐ کے افضل الخلیق ہونے پر دلیل ہے۔ رحمت اللعالمینؐ ہو نیکی سند ہے۔ اسی لئے تو آپؐ نے فرمایا نیک اللہ کے، گنہگار میرے۔ قیادت میں بھی حضورؐ مقامِ محمود پر ہوں گے اور اپنی امت کی شفاعت کے علاوہ دوسرے انبیاء کی اُمتوں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اس سے زیادہ تسکینِ قلب انسان کو کہاں نصیب ہوسکتی ہے۔ جو اسلام میں داخل ہوا وہ دائمی امن میں آیا۔ اسی لئے حضور اکرمؐ کے پیام کی شیرینی نہ صرف غریبوں اور مصیبت کے ماروں کو اپنے دامنِ رحمت میں سمیٹ کر لے گئی بلکہ گنہگار، خطا کار غرض ہر قسم کے لوگوں کو سلامتی، امن، آشتی، اخوت، صلۂ رحمی کا پیام پہنچا۔ یہ بیان کسی قبیلے کے لئے نہیں تھا بلکہ عالمِ انسانیت کے لئے تھا۔ اسی لئے آپؐ کے کلام میں وہ تاثیر تھی کہ فطرت انسانی اس سے ہم آہنگ ہوئی۔ جس نے سنا فریفتہ ہوا۔ ابوجہل جیسا دشمن آپؐ کی حق گوئی اور سحر بیانی سے گھبرا کر لوگوں کو کہتا کہ کانوں میں روئی رکھ کر ان کے پاس سے گزرنا، ایسا نہ ہو کہ ان کی

آواز سُن لو اور ان ہی کے ہو کر رہ جاؤ۔ اسی طرح آپؐ کے جمال پر انوار کی وہ شان کہ جس نے دیکھا فریفتہ ہوا۔ ''مَنْ رَّآنِیْ فَقَدْ رَآ اَلْحَق'' کے تحت جس نے آپؐ کو دیکھا اس نے گویا خدا کو دیکھا۔

حُسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کیوں نہ ہو جب محبوبِ رب العالمینؐ کے خطاب سے نوازے گئے ہوں اور اس طرح کہ خدا اور فرشتے درود بھیجیں اور آپ کا ذکر آسمانوں میں بلند کر دیا گیا ہو۔

یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا احسان ہے کہ آپ نے محبّت کی بنیادی حیثیت کو، صرف تخیّل کے پہلو تک یا آئیڈیل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ بلکہ روزمرہ زندگی میں اس کی قابلِ عمل صورت پیش کر دی۔ اسلام میں داخل ہونیوالے کیلئے، جمعیّت بندی، صلح پسندی، رحمدلی، انسانی ہمدری، ایثار، قربانی توکل، عجز، انکسار، صبر، شکر، دیانتداری، امانت، سخاوت، عدالت، شجاعت اور دوسری اعلیٰ اقدار کا سبق دیا۔ ان کو آئینِ دین قرار دیا۔ یہ سبق محض واعظ ونصیحت کی حد تک نہ تھا کہ وہ تو بہت کچھ دوسرے پیغمبرانِ خُدا کرتے رہے تھے۔ اب انسانی زندگی کو عملی طور پر تشکیل دینے کیلئے خود حضور نے اپنے کردار کو نمونہ بنا کر، ان اعلیٰ اقدار کی شرف وفضیلت کو اپنی اُمّت کی زندگیوں کا جزو بنا دیا۔ تاکہ یہ مثالی جماعت، جو صحابۂ کرام کہلائی تمام عالم کیلئے آخرت تک کیلئے نمونہ بن کر پیش ہو۔ عمل پر یہ زور اس لئے تھا کہ کسی نظریئے کی اسپرٹ پڑھائی نہیں جاتی، بلکہ پکڑی جاتی ہے۔ دل اسکو قبول کرتا ہے تو خود بخود عملی زندگی کا یہی نہ جدا ہونے والا حصہ بن جاتی ہے۔ اسلام کے پیامِ محبّت میں انسانیت کیلئے عملی رحمت تھی، جمعیّت کی شکل میں قوّت، برکت و رحمت تھی، فرد کیلئے فروغ ظاہر و باطن کی راہ کشادہ تھی۔ اسی لئے اسلام میں داخل ہو کر حقیقت بینی پر انسان کا شعار بنی۔ مسلم کی نظر ہمیشہ ماسوائے سے بلند ہو کر حقیقت کی جانب رہی اور دینِ متین بجلی کی طرح پھیلنا شروع ہوا۔ خواصِ جمعیّت کا یہ رنگ ہوا کہ قلب کی منازل سے اٹھا کر رحمتوں کے سائے میں روح اور عالمِ امر سے ان کا رابطہ کرا دیا گیا کہ آخر یہی تو ہر شے کے ظہور کا منبع تھا۔ عوام نے بھی اس

پیام کو قلب کی گہرائیوں سے اپنایا اور نبی کریمؐ کے گرد پروانہ وار جمع ہوتے گئے۔ محبّت کے طفیل باطنی اعلیٰ اقدار جاگیں، یہ شعور سے پرے کی بات تھی جب لاشعور اور لاشعور کا لاشعور تک سنورتا گیا تو نیچے کی منازل میں خود بخود فروغ اور جلا آنی تھی، اس طرح باطن کی سطح پر یہ قوّتِ کنٔی اُمّت کو عطا کر دی گئی پہلے۔ زمانوں میں یہ کہاں ہوا تھا، دینِ برحق کا امر بسمِ اللہؐ ہی تھا۔ جس نے انسان کو اس کے مدارج اعلیٰ کی طرف بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کی مادّی زندگی کو بھی بدل دیا۔ عوام انسانیت کیلئے اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی۔ اب امت کا یہ حال ہوا کہ ایک طرف اللہ و رسولؐ سے رابطہ قائم ہوا اور دوسری طرف خلق سے دل بہ یار دست بہ کار ہر مسلمان کا شعار ہوا۔ جب انسان کا ہر کام ہی یار کیلئے ہو گیا تو زندگی اب بامعنی زندگی ہو گئی یُسَبِّطُوْلَکُمْ، اسی انداز میں ظہور پذیر عالم ہوا کہ روحانی منازل اور جسمانی منازل بھی اس کی تسخیر میں آ گئیں۔ ایک جانب حقیقت شناسی کی منازل کی طرف پرواز شروع ہوئی اور دوسری جانب کاروبارِ جہاں کو ایسا سنبھالا گیا کہ یہی انسان خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْض کا مصداق بنا۔ یار نے بھی اس محبوب کو ایسا نوازا کہ قدرت کے خزانوں کی چابی ہی اس کے حوالے کر دی۔ یہ تھا نبی اسمٰعیل کا وہ عروج جس کے آگے بنی اسرائیل ماند ہو گئے۔ اب عالم انسانیت کیلئے ظاہر باطن کی نئی راہیں کھل گئیں۔ ظاہر باطن دونوں کو میزان میں رکھ کر جب یہ جماعت آگے چلی تو دنیا کے اوپر رحمت بن کر چھا گئی۔ اسلام کا ابتدائی چالیس سالہ دور آتی دنیا کیلئے عملی پہلو کی مینارِ نور ہے۔ اب آئندہ آنے والے زمانوں کو یہ اسلام کی اسپرٹ اسی ہدایت کی روشنی میں حاصل ہو سکے گی یہاں تک کہ وہ ''امرِ بسم اللہ'' ''امرِ کُن'' کو پا جائیں گے۔ یہ حاصل ہونے کے بعد ہی انسان کو وہ مقام مل سکے گا۔ جو حق نے اپنی کثیر محبّت میں اس کیلئے مقرر کیا ہے۔ حق نے آخر اپنی شان کے اظہار کیلئے ہی تو انسان کو پیدا کیا ہے اور اسی اظہار کیلئے اسے اپنے اسما، اپنی قدرتوں اور اپنی صفات سے نوازا۔ یہی وجہ تو ہے کہ انسان کی ساری ظاہری و باطنی صلاحیتیں ان ہی قدرتوں اور نعمتوں کا انکشاف کر رہی ہیں۔ مادّی دنیا میں جتنا بھی ان صلاحیتوں سے انسان نے کام لیا، ترقی کی۔ مگر قلب اور روح کی منازل میں قدم رکھتے ہوئے، مادّیت میں گرفتار انسانیت جھجک رہی ہے اور غافل ہے۔ قلب

و روح کی منازل میں تو انسان کو کہیں زیادہ قدرتیں بخشی گئی ہیں۔ اپنے عقل و حواس کی حد تک تو انسان نے جان لیا کہ اس کے دنیاوی اعمال اس کی عقل اور ارادہ کے تابع ہیں اور یہ کہ بعض خصوصی اعمال کی باگ ڈور اس کے لاشعور اور لاشعور کے لاشعور میں ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی کافی حد تک مان لیا کہ اگر ہمارے ان اعمال میں جو ہماری عقل و ارادہ کے تابع ہیں دل کی چاہ بھی شامل ہو جائے تو پھر ان ہی کاموں میں شدّت اور خلوصِ عمل آ جاتے ہیں۔ اب سوچا جائے کہ اس دل کی چاہ کو اگر اللہ کا سہارا مل جائے تو ہمارے ہر ظاہری عمل تک کا منبع امرِ باللہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا امر باللہ کے سہارے اپنی زندگیوں میں عمل کی شدّت اور اس کی گہرائی کا کون انکار کر سکتا ہے، امر کی دنیا فروغ کی دنیا ہے، جہاں اللہ کا کُن ہے۔ یہی جانِ اسلام ہے۔ اسی جگہ سے ہماری دنیا کے ہر عمل، ہر واقعہ کا ظہور ہے یہ کُن کا تصرّفِ اسلام قولِ فیصل کا احسان ہے۔ اسلام جو حضور اکرمؐ نے پیش کیا جس سطح سے شروع ہوتا ہے وہ امر کی دنیا ہے۔ البتہ یہ اسلام کا خصوصی احسان ہے کہ نیچے قلب و نفس کی منازل کو بھی بندگی کے رنگ میں اپناتا ہے۔ یہ راز نبی کریمؐ کے طفیل صرف اسی امّت کو نصیب ہوا کہ اُدھر اللہ سے واصل، ادھر مخلوق میں شامل۔ وصل وصلوۃ ہم معنی ہیں۔ محبوبیت کے انوار ہیں۔ جو سراپا محبوب کے رنگ میں رنگ جائے۔ وہ مقام روح پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ یہاں نہ اپنا ارادہ ہے نہ اپنا تخیل۔ نہ اپنے عمل کا اختیار۔ جو یار کی مرضی۔ یہ حیاتِ روح ہے۔ یہاں کا اختیار، حقیقت سے ہم آہنگی ہے، یہاں وہ فروغ زندگی ہے جو انسان کو فطری طور پر عطا ہوا ہے۔ یہ کُن۔ یہ ارادہ، دوسری طرف ہی کا ہے اس میں اپنا دخل نہیں۔ یہ رحمت کے سایوں میں ہے اور رحمت کا وسیلہ وہی ہے جو اس رحمت کے ظہور اور نفاذ کا مرکز ہے۔ یہ رحمت اللعالمینی رابطہ ہے۔ اس خالقِ کائنات کی نگاہ اپنے عالم خلق پر رحمت و احسان بن کر چھائی ہے۔ ہوا، پانی، غذا، روشنی مومن مشرک سب کیلئے انعام ہے۔ رحمتِ کثیر عام ہے، گو اس رحمت کو محسوس کرنے والے اور شکر گزار ہونے والے صرف عاجز و مسکین قلوب ہی ہوتے ہیں۔ یہی وہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ کہ اپنی لو، حق سے لگائے ہوتے ہیں اور اسی تک رسائی کی تڑپ میں اپنی زندگیاں گزارتی ہیں۔ نفس پرست اور خودغرض انسان کو جانتا ہے کہ چند مخصوص افراد یا قوموں کے لئے نہ کائنات

بنائی گئی اور نہ اللہ کی رحمت صرف ان کیلئے مخصوص ہے۔ یوں بنی اسرائیل پر خصوصی انعام و اکرام ہوئے مگر مقررہ مدّت تک ہی۔ انہیں دنیا تو عطا کی ہی گئی تھی۔ ان کا دین اور عاقبت تک سنوارنے کیلئے یکے بعد دیگرے ان میں پیغمبر بھیجے گئے تا کہ دوسری قوموں کے لئے یہ افراد، ہدایت کا نمونہ بن کر پیش ہوں، مگر اس قوم کا نسلی غرور اور غرورِ شخصیت اپنی ناشکریوں سے اور بڑھتا ہی گیا۔ عاجزی کا دامن انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھوڑا۔ نتیجتاً اللہ تعالیٰ کی بے نیازی نے فروغِ دین و ہدایت کیلئے دوسری راہ کھول دی۔ بنی اسرائیل سے، بنی اسمٰعیل میں چراغِ ہدایت پہنچا، ہدایت ابراہیمؑ کی نسل ہی سے حضور نبی کریمؐ تشریف لائے۔ ذاتِ باری کی صفتِ رحمت کا ظہور اکملیّت کے انداز میں ہوا اور صرف رحمت بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کی شکل میں نہیں بلکہ رحمتِ عالم ہو کر۔ اس رحمت للعالمینی شان کے اجراء کیلئے نبی کو آخر الزمان ہونا ہی تھا۔ حضورؐ کے بعد سے یہ رحمت، اب حضورؐ کی نسبت کے طفیل ہی جہاں میں نافذ ہے۔ کیونکہ قدرت کی ہر صفت اور حق کے نشر کیلئے ایک مادّی وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مجمع الصفات وجود کے ذریعے ہی ذات کا نشر ہو سکتا ہے۔ فطرت کی ہر قوت و توانائی کے ساتھ یہی انداز ودیعت ہے کہ توانائی کا اظہار بغیر مادہ کے ممکن ہی نہیں۔ پھر توانائی سے بالا صفات، رحمت، برکت، فضل اور سارے مجرّد اتِ فطرت، بغیر وجود جامع الصفاّت کے کیسے ظہور پذیر عالم ہو سکتے تھے۔ حضورؐ کے بعد اب حضورؐ کے وسیلے سے، آمرانِ حق اس رحمت اللعالمینیؐ شان میں خود صبر و رضا کی تصویر بن کر دنیا میں آتے رہے اور حضورؐ کی ذات سے یہ استقامت دین حاصل کرتے رہے۔ یہ سمجھنے سمجھانے یا پڑھنے پڑھانے والی بات نہیں بلکہ ہو جانے والی بات ہے۔ خود حضور اکرمؐ کی زندگی مبارک پر نظر ڈالیں تو رحمتِ عالم کے معنی کچھ روشن ہو سکیں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جتنا حضور اکرمؐ کو ستایا گیا، کسی نبی کو ایسی تکالیف ذاتی اور خاندانی نہیں پہنچیں۔ آخر جتنی تنگی و عسرت میں آپ نے زندگی بسر کی جتنی سختیاں آپ نے جھیلیں، اسلام کے ناموس کیلئے آپ کی اولاد نے جتنی قربانیاں دیں، وہ سنت کتنے مسلمانوں نے ادا کی۔ طعن و تشنیع پر جب قوم مطمئن نہ ہوئی تو بے جرم و بے خطا، شعب ابی طالب میں محصور کر دیئے گئے، کھانا پینا، بول چال بند، راستوں میں کانٹے بچھائے گئے، گڑھے کھودے گئے۔ قتل کی

سازشیں ہوئیں، گندگیاں سر پر پھینکی گئیں، وہ بھی نماز کی حالت میں، پتھر مارے گئے۔ لہو و لہان کر دیئے گئے۔ قوم کے درد کی خاطر کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ بھوک کی سختی برداشت کرنے کیلئے پیٹ پر کئی کئی پتھر باندھے۔ پھر وطن جس بے کسی کی حالت میں چھوڑنا پڑا۔ بے یارومددگار کمزور و مختصر جماعت پر ہزاروں کا لشکرِ مسلح بار بار چڑھ آیا۔ جنگیں بھی کرنا پڑیں دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے، عزیز و اقارب شہید ہوئے، غم پر غم اور چوٹ پر چوٹ لگی۔ مگر کوئی حرفِ شکایت زبانِ مبارک پر نہ آیا۔ پھر آپؐ کی اولاد پر جو آپ کے بعد گزری اور جس کی پیشین گوئی آپؐ نے پہلے فرمادی تھی اس کو شمار میں لایا جائے تو خون کے آنسو بھی بہائے جائیں تو کم ہیں۔ کیا تاریخِ انسانیت میں کسی نبی کی اولاد کو ایسا ستایا گیا۔ جیسا کہ آپؐ کی اولاد کو۔ کیا کسی خاندان پر ایسے مظالم ڈھائے گئے جیسا کہ کربلا میں حسینؑ پر، خیال کریں تو رحمت للعالمینؐ کے اس صبر و استقامت کے تصوّر سے ہی بدن کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ اللہ جس کا سارا قافلہ لٹ گیا ہو۔ جس کے بھائی بھتیجے، عزیز اور بیٹے اپنی آنکھوں کے سامنے شہید کئے گئے ہوں۔ وہ آخر میں تن تنہا اس رحمت کے رنگ میں قوم کو معافی دینے آگے بڑھتا ہے کہ ننھے معصوم بچے کی لاش ہاتھ میں ہے۔ اس کی یہ پیشکش اس قوم پر اتمامِ محبّت کی خاطر، صرف اس لئے تھی کہ اس کی رحمتِ کثیر یہ نہیں چاہتی تھی کہ عاقبت میں بھی ان لوگوں پر عذاب ہو۔ وہ اس دنیا میں بددعا یا عذاب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ رحمت اللعالمینؐ کے اجراء کا ذریعہ اب یہی ذاتِ گرامی حسین علیہ السلام تھی۔ زمانہ شاہد ہے کہ رحمت للعالمینؐ کے نواسے نے رحمت للعالمینی شان کا اظہار ایسے وقت میں بھی کیا جب کہ انسان غم و اندوہ اور غصہ میں جو بددعا بھی نکال دے وہ ہو کر رہے۔ ان واقعات کی روشنی میں اب ہمیں خود سمجھ لینا ہے کہ رحمت للعالمین کیا چیز ہے اور کتنے دل جگر کی بات ہے، کتنے صبر و آزمائش کا مقام ہے۔ بدنصیب، خطا کار، ظالم اور منافق لوگوں پر بھی رحمت کا یہ عظیم احسان کہ ان کی دنیا خراب نہ ہونے پائے، ان کی عاقبت برباد نہ ہو۔ اپنی اولاد اپنی عزت و آبرو کی پامالی کے بعد بھی اس طرح دعائیں کس کے منہ سے نکلی ہوں گی۔

حضورؐ کی روزمرہ زندگی پر نظر ڈالی جائے تو سوائے مسکینی اور عاجزی اور صبر و استقامت کے کیا

پائیں گے۔ رہنے سہنے کو چھوٹی سی کوٹھڑی، سونے کو فرشِ زمین، بوریئے اور ٹاٹ کا بستر ا، غرض ایک ''لا نَبِی'' اور ختم نہ ہونے والی تفصیل ہے کہ اس کی انتہا تک عقل کے سہارے کیسے پہنچا جائے۔ اس تنگی کی زندگی میں کہ خود فاقوں پر فاقے اور روزوں پر روزے رکھے جا رہے ہیں۔ عمر بھی پچاس سے زائد ہو، حرم میں کئی ازواجِ مطہرات کو جگہ دی گئی۔ ناموس انسانیت کو اپنے دامنِ رحمت میں چھپانے کیلئے زمانہ کے رسم کے مطابق شکست خوردہ قوموں کے سرداروں کی بی بیوں کو عزت و احترام سے رکھا ہے۔ عورت کو غلامی کی قصرِ مذلت سے نکال کر اس کا صحیح مقامِ مادر ملت عطا کرنے کیلئے وہ شرف بخشا کہ بیوہ، مطلقہ، اسیر و مظلوم عورتوں کو اُمہات المومنین کا مقام عطا ہوا۔ امت کی ان پاک دامن اور صابر ماؤں نے تنگی و عسرت کی زندگی گزارنے ہی کو شرف انسانیت سمجھا اور آنے والی دنیا کے آگے اپنے کردارِ جمیل کی ایک نہ مٹنے والی یادگار چھوڑ دی۔ سطحی نظر رکھنے والے اس توکل و صبر کا اندازہ کیا لگا سکتے ہیں جو ان حالات میں روزمرہ زندگی میں درپیش تھا۔ کیسے ملازم، کیسا سامانِ آرائش و آسائش۔ یہاں تو عجز و مسکینی و غربت کا ایک عملی نقشہ دنیا کے آگے پیش کیا جا رہا تھا جو ان قدوسی ہستیوں نے بخوشی قبول کر رکھا تھا۔ یہ تھیں، ''اَلصَّابِرِیْنَ فِی الْبَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ'' (صبر کرنے والے آسائش اور سختی میں) کی زندہ تصویریں، اس طرح عاجزی و مسکینی پر صابر ہو جانا انسانی تخیل و فہم سے بہت دور کی چیز ہے، یہ دراصل احسان ہے اسلام قولِ فیصل کا اس کائناتِ عالم پر۔ اسلام دینِ امن و آشتی، سلامتی و سکون اسی صبر و عاجزی و مسکینی کے ذریعہ پیش کرتا ہے اور اسی طور پر اپنے پیرویان کو سنّتِ نبوی کی پیروی کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں **رحمت للعالمینؐ** کردار کی یہ بلندی روشن ہو جاتی ہے کہ خلقت کو خالق کی نظر سے دیکھا جائے۔ نیک، معصوم، مفلوک الحال، غلام و یسیر ہی نہیں بلکہ ظالموں تک کو عذابِ دوزخ سے نجات دلانے کی کوشش ہو، ہر ایک کو کاندھوں پر اٹھایا جاتا ہو کلیجہ سے لگایا جاتا ہو۔ تاکہ احترامِ آدمیت کا حق ادا ہو جائے۔ ایک رخسار پر تھپڑ کھا کر دوسرا رخسار بھی پیش کر دینا صبر کی تصویر سہی مگر یہ صبر جس کا بیان کیا جا رہا ہے اس سطح کا ہے جسے زندہ سکون کہہ لیں اور جس میں فروغ ہے۔ حیات ہے، یہ سکون، کائنات سے ہم آہنگی ہے اور یہ صبر اپنے ظاہر و باطن کی میزان ہے۔ یہ رحمت عالم کا

انداز گویا ایسا ہے کہ فطرتِ انسانی کی ہر بھلائی، برائی کے ساتھ مکمل صبر و استقامت ہے۔ یہ گویا خالق و مخلوق کے درمیان توازنِ وجود بن جانے کی بات ہے۔ اس شدّتِ رحمت **للعالمینؐ** میں کیسا پیشانی پر بل آنا یا کیسا مجبوری و غربت و مسکینی کا نقشہ دکھانا۔ اس مقام کی افضلیت تو یہ ہے کہ یہاں سے انسانیت کو ایک نرالا ہی سبق دیا جا رہا ہے۔ یہ حیات و ثبات و قیام و نمود فروغ کا ایک پُرسکون سمندر ہے کہ اس پر لاکھ تھپڑ ماریں، پتھر پھینکیں، ڈنڈے ماریں، مگر اس کا سینہ ہر ضرب کھانے کے بعد پھر اسی فطری سکون میں ہو جاتا ہے جیسا کہ ذاتِ گرامی حضور اکرمؐ، حضرت حسینؓ، صحابۂ اکبرؓ، جمیع اولیا و صالحین کو تھا۔ رحمت **اللعالمینؐ** شان کے یہ مظاہر، ساری کائنات کو کلیجہ سے لگائے آج بھی سمندر کی طرح ساکن ہیں اور یہاں سے رحمت کے بادل اٹھ اٹھ کر کائناتِ عالم پر لگاتار گوہر افشانی کر رہے ہیں۔

☆☆☆☆

باب ۷

اِسلام الاسلام

اب اسلام دین فطرت کے چاروں انداز، براہیمی، موسوی، عیسوی، محمدیؐ پر پھر سے نظر ڈالی جائے کہ جس دین پر عالمِ انسانیت کو پیدا کیا وہ ایک ہی تو ہے۔ اسی دین کیا شاعت و تکمیل کیلئے مختلف قوموں میں مختلف انبیاء زمانے کے لحاظ سے آتے رہے۔ یہاں تک کہ خاتم النبین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰؐ پر دین کی تکمیل ہوئی۔ لہٰذا دین کی مختلف منازل کو اگر ایک ہی کڑی میں دیکھا جائے تو وہ نقشہ واضح ہو جائے جو منشائے قدرت ہے اور وحدانیتِ حقیقت کا انکشاف ہے بقول علامہ اقبالؒ

خلق و تقدیر و ہدایت اوّل است　　رحمت اللعالمینؐ آخر است

براہیمی اسلام خلق سے تعلق رکھتا ہے گو اس میں تقدیر و ہدایت مضمر ہے۔ موسوی اسلام میں ان ہدایات پر عمل کرانے پر زور ہے۔ اپنے عمل کی نسبت سے نتیجۂ آخرت منحصر ہے۔ اس طرح اپنے عمل پر اتنا بھروسہ ہے کہ تقدیر الٰہی، رحمتِ الٰہی کی طرف سے توجہ یکسر ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تقدیر اور مرضی الٰہی کے مطابق شاکر و مسرور رہنا حضرت عیسیٰؑ کے مقام پر آتا ہے۔ اور رحمت کا ظہور، حضورؐ سرور کائنات کے مقام پر تجسّسِ حقیقت و عشقِ ذات کا پہلا قدم تو حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ جیسا کہ جوانی میں حُسن کی تلاش ہوتی ہے۔ ایک کھوئی کھوئی سی کیفیت کسی چیز کا تجسّس، پھر اس کے بعد دورِ موسوی آتا ہے۔ کہ اصول کی حدود قائم رکھتے ہوئے وہ شدّت آتی ہے۔ کہ میں دیکھوں گا، میں بات کروں گا، اس کے بعد عشق بڑھتا ہے تو عیسوی رنگ اثر پذیر ہوتا ہے۔ طریقت کا ادب اور طریقہ اسکی روشنی ہوتی ہے۔ پھر محبوبیت کا جمال دمک اٹھتا ہے۔ یہ محمدیؐ انوار ہے۔ اب معشوق کے ہاتھوں میں خزانوں کی چابی دے

دی جاتی ہے۔ رحمتِ عالم ہو کر خلق میں پیش ہوتا ہے۔ جو چاہا وہ حق کی مرضی۔ جو کہا، ہو گیا۔

رحمت کا کیا بیان کیا جائے۔ رحمت بے حساب ہوتی ہے۔ بے وجہ ہوتی ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے بالاتر چیز ہے۔ رحمت ایک تجرید کا نام ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ کائنات میں ماحول کے مطابق حیوانات کے رنگ بدلنا، یا طاقتور کی زندگی برقرار رہنا ایک عقل کل کے ماتحت ہو رہا ہے جس کا تجریدی انداز یہی رحمت ہے۔ کہ مفید ترین اشیاء یا جاندار برقرار رہتے ہیں۔ اور بے کار ہٹا دئے جاتے ہیں۔ یا پھر شہید اپنے پاک خون سے، مجاہد اپنے پسینہ سے، مفکر اپنی فکر سے، خادم اپنی خدمت سے، دعا گو اپنی دعا سے، ایک حیاتِ نو عالم اِنسانی کو عطا کرتے ہیں۔ اسلام اسی قسم کی رحمتوں کا سبق دیتا ہے اور دوسرے مذاہب پر اس قِسم کی سبقت رکھتا ہے۔ یہ رحمت ہی تو ہے جو سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیَ (میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی) کی صورت میں انسانیت پر ہے۔ اسی کے طفیل گمراہ، بھٹکے ہوئے بھی ربوبیت کی نظرِ کرم پائے ہوئے ہیں اور مستقبل کی امیدیں ان کیلئے روشن ہیں۔ پھر جنہوں نے رحمت اللعامینؐ دامن پکڑا، انکے وجود پر انوار پڑنے لگے۔ کلمہ کی تکمیل ہوئی۔ کلمہ کی تجلی ہوئی۔ دل چلا اٹھا کہ مجھے معلوم ہو گیا۔ مگر کیا معلوم ہوا، اس کا نہ شعور نہ ادراک جاننا نیچے کی سطح کی بات تھی عقل کی حد تھی مگر تجلی یا عرفان جو بغیر شعور کی مدد کے ہوا وہی تو عرفان ہے۔ اسی لئے کہہ سکتے ہیں کہ عارف جانتا کچھ نہیں مگر اسے معلوم سب کچھ ہے۔ یہ سنی سنائی کا جاننا نہیں ہے بلکہ عین ہے۔ اسلئے جس نے دیکھا وہی کہہ سکتا ہے کہ مجھے معلوم ہے۔ لہٰذا کلمہ لا اِلٰہ اللّٰہ محمد رسول اللہ پڑھ لیا تو کیا۔ جب عین ہوا تب تجلیٔ رحمت اللعالمینؐ ملی۔ مگر بیشتر کلمہ گو کا یہ حال رہا ہے کہ نہ اس توحیدِ ذات و مجرّدات تک رسائی ہو سکی جو براہیمی اسلام کی پونجی ہے۔ نہ اس تجلی و کلام سے پہلے نوازے گئے جو موسوی اسلام و علم لدّنی کا اثاثہ ہے۔ نہ ان وارداتِ قلب سے گزرے جو عیسوی اسلام کی جان ہے۔ باطن کا ارتقاء ہوتا تو زینہ بزینہ ارتقاء کی منازلِ قرب نصیب ہوتی۔ جسمانی ارتقاء تو شکم مادر میں اپنی کروڑوں سالوں کی منزلیں پوری کر لیتا ہے۔ اسی طرح روحانی ارتقاء حضرت آدمؑ کی منزل سے لیکر حضور نبی کریمؐ کے مقام تک آغوشِ شفقتِ شیخ میں نصیب ہوتا ہے۔ یہ روحانی منازل،

قرب کی منازل ہیں، عالمِ امر کی وارداتیں ہیں اس لئے بغیر عشق اور سایۂ کرم کے کام نہیں بنتا۔ یہاں اپنی کوششیں محدود ہیں۔ نفس اور قلب کے مقامات تک رسائی تو کچھ حد تک اپنے ہاتھ میں ہے۔ گو یہاں بھی کسی کے کرم ہی سے دروازے کھلتے ہیں۔ جب یہ ارتقائے باطن اپنے میں ہوتا ہے تو ظاہر اس کی تصدیق کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ گویا عشق کی کلی کا کھلنا ہے۔ بوئے مشکِ ذات کا اپنے نافۂ ذات میں پھوٹنا ہے۔ محبت و عشقِ ذات کی اپنے آئینہ میں رونمائی ہے۔ اسلام ارتقائے باطن پر اسی انداز میں رجوع کرتا ہے کہ دنیوی اور آخرت کی زندگی ایک ہی سلسلۂ ارتقاء کی کڑی ہیں۔

حیاتِ باطن کی پہلی نشانی وہی تجسّس، تڑپ، تلاش کا براہیمی جذبہ ہے جس کی صداقت کا خود دل گواہ ہوتا ہے۔ یہ تلاش و تجسّس دراصل انسان کی فطرت میں ہے۔ اسکی ایک سطحی مثال، موجودہ زمانے کے نوجوان کی بے چینی ہے۔ یورپ کے نوجوانوں کو دیکھیں کہ نامعلوم شے کی تلاش میں، سکون کے طالب بن کر مشرقی ملکوں کی طرف نکل پڑے ہیں۔ اس قدرتی بے چینی کی مادّی اور ظاہری وجہ کوئی نظر نہیں آتی کیونکہ مادّیت اور فکر و فن کے لحاظ سے یورپ کی زندگی کا معیار آج بھی بلند ہے اور وہاں کے تمام ممالک میں کسی نہ کسی قسم کا فلاحی نظامِ حکومت ہے۔ اس کے علاوہ نہ وہاں سماجی و معاشرتی بندشیں ہیں۔ نہ خاندانی۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روح کی بے چینی کی وجہ سے اندرونی اضطراب نے سطحی صورت یہ اختیار کر لی ہے کہ آج کے نوجوان نے پچھلے زمانے کی قوم سے ہی بغاوت کا رنگ اختیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ ان قاعدے اور قوانین کی سختیوں کو پسند کرنے والے انسانوں نے کسی نہ کسی طرح قومی زندگی کیلئے ایک ضابطہ حیات مقرر کر رکھا تھا اب ان ہی بندشوں سے نجات اور آزادی کیلئے نوجوان طبقے کا یہ ردِّ عمل ہے اسکی ایک وجہ اور بھی ہے کہ دوسری جنگِ عظیم نے ساری منافقتیں، ساری سنگدلیاں، سامنے لا کھڑی کی ہیں جن کی وجہ سے ذہن و فکر کا ردِّ عمل نوجوانوں میں ضروری تھا۔ فیضانِ نظر انہیں کسی کا، ملِ نہ پایا اس لئے صرف ذہنی انتشار، بغاوت، اور بے اطمینانی میں مبتلا ہو گئے۔ اب یہ نوجوان، ان حالات سے بیزار ہیں جن کی بنیاد مادہ پرستی ہے۔ کیونکہ اس تہذیب نے کبھی آدمی کو حیوانِ ناطق سمجھا، کبھی سماجی جانور، لیکن عرفانِ حقیقت

یا خودشناسی کرنے کے لائق کبھی اسے باعثِ تکریم قرار نہ دیا۔ اب یہ سطحی ہیجان کے پیچھے دراصل باطن کی تڑپ ہے۔ جو حقیقت کی آواز ہے اور ہر ایک کے باطن سے اٹھ رہی ہے۔ یہ روح کی تڑپ ہے۔ یہ تجسّس، یہ تلاش، اب وقت سے ختم نہیں ہوتی یہ زخم خوردہ انسانی احساسات کی اندرونی پکار ہے، جو حقیقت کی طرف رجوع چاہتی ہے۔ یہ تجسّس خودی، ایک نامعلوم شے کی تلاش میں انسانیت کا اتار چڑھاؤ ہے۔ مگر عقل کی کوتاہ بینی اور مادہ پرستی کی وجہ سے اس کی حدود ظاہر تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ اب اس سطحی ہیجان اور بے اطمینانی کی صورت یہ بن کر رہ گئی ہے کہ موجودہ مہذّب انسان اگر زندگی میں کامیاب ہے تو عیش و نشاط میں پڑا ہے اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس کا نصب العین یہی رہ گیا ہے کہ حیوانی حظائظ نصیب ہوتے رہیں۔ اور مادّی ضروریات پوری ہوتی رہیں وگرنہ اس کیلئے جینا محال ہے۔ نفسانفسی میں گرفتار، انسانی اقدار سے گرِا ہوا اور تمام نچلی صفات میں الجھا ہوا فرد، اب ایک بے مقصد سی زندگی گزار رہا ہے۔ نہ اسے علم ہے کہ کہاں جانا ہے نہ اس کا کوئی عقیدہ ہے، نہ ضابطہ حیات، نہ کوئی اقدار۔ کاش وہ یہ بھی جان لیتا کہ یہ اپنی روح کی بے کلی کا احساس ہی ہے جو اسے بے چین کئے ہے۔ اور یہ روح کی آواز ہے، حقیقت کی آواز ہے جو اپنے باطن سے اٹھ رہی ہے اور تجسّسِ حقیقت کیلئے اسے بیدار اور عازمِ عمل کر رہی ہے۔

موجودہ اسلام کے نام لیوا خود بھی اپنا جائزہ لیں کہ وہ خود کس حد تک، اسی ابتلاء میں گرفتار ہیں۔ روحانی تجسّس اور تلاشِ حقیقت کا انداز انہیں کس حد تک بے تاب کئے ہوئے ہے۔ انہوں نے کہاں تک دین کی بنیاد براہیمی انداز کو اپنایا ہے۔ اس کے بعد شرع ھُدیٰ کو کس انداز میں پکڑا اور کس سطح پر عمل پیرا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب نظر و تخیل ہی حقیقتوں کی طرف عروج کرنے کے رخ پر نہ ہو، جب اس شرع کو پابندی سے پہلے تجسّس و تڑپ اس حق شناسی کی طرف مائل نہ ہو جو انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے تو کیا شرع کی پابندی۔ جب محبت کے انداز کو اپناتے ہوئے حق طلبی نہ کی جائے۔ جب تک خالق سے محبت کا انداز، اس کی مخلوق سے محبت اور ان کی خدمت کر کے پورا نہ کر لیا جائے۔ تو دین، اور خداپرستی کا کیا نام لینا۔ ظاہرداری سے رسومِ شرع کی پابندی سوائے خودفریبی اور خود پرستی کے کیا رہ جاتی

ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ شرع و آئین محبت کو سمجھ بھی نہ سکے اور شومئی تقدیر سے اس میں الجھ کر بھی رہ گئے۔ اصل شرع، لگاؤ اور محبت کا انداز ہے اور اللہ سے لگاؤ کی شرط اس کی خلقت سے لگاؤ ہے۔ یہ ہے بنیادِ اسلام۔ اور ہم ہیں کہ دینِ اسلام کے استخوان سے تو چمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر جانِ اسلام سے کافی دور ہیں۔ یہ عشق کی، روح کی واردتیں ہیں۔ یہ امر باللہ کے مقامات ہیں۔ یہ رحمتؐ للعالمین کے صدقے رحمت کے مقام ہیں۔ یہاں بغیر وسیلۂ محمدیؐ کے دسترس نہیں۔ براہیمی انداز میں رنگ جانے کے بعد عرفانِ وحدت حقیقت ہونا تھا۔ اسکے بعد موسوی اسلام کا سبق، اصولِ شریعت اور قوانینِ فطرت کی پابندی، علم لدّنی، تجلّی اور کلام ہوتا تو پھر شدّتِ شوق، عشق کے طفیل نفس اور مادیّت کے پہلو چھڑا کر ملکوتی صفات میں لا کھڑا کرتی جو عیسوی اسلام کا اندازہ تھا۔ یہاں سنتِ الٰہی قوانینِ عقل و فطرت کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ دوسرا انداز لئے ہوتی ہے جسے قلب تو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل حیران رہتی ہے۔ یہ فضل، نعمت، برکت، رحمت، کی دنیا ہے جسے عالمِ اسباب میں گھری ہوئی انسانیت کیا سمجھے! عقل و نفس کے جھول تو خدا کو، معاذ اللہ بس قوانین فطرت اور سائنس کے اصولوں کا پابند ہی سمجھتے ہیں۔ انہیں خدائی شان کے انداز فضل برکت، رحمت، محبت، حیات، کبریائی، قادریّت، قیومیت، جباریت، قہاریت، رحمانیت، رحیمیت وغیرہ کیسے سمجھ میں آئیں۔ عام تخیّل انسانی اس سطح سے بلند ہی نہیں ہوتا کہ جہاں اپنے کو مجبور پایا۔ وہاں قسمت کی آڑ لے لی۔ باقی عام چیزوں میں اپنی مختاری سمجھ کر، ایسی زندگی گزاری کہ خدا کا تخیل تک غائب۔ اسی لئے یہ مسئلہ جبر و قدر کو نہ جبار کے انداز میں اپنا سکے نہ قادر کے۔ نہ ان کی حیات حیّ کے انداز میں ہے، نہ قیام، قیوم کے رنگ ہیں۔ اب ان ہی صفات حمیدہ، ان ہی آیات اللہ ان ہی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جن سے انسان کا وجود نوازا گیا ہے اگر افراد سطحی طور سے زندگی گزار لیتے ہیں۔ تو یہ شریعت کی حد ہے۔ جس کو ایک حد تک بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں اپنایا اور بعد میں آنے والی انسانیت اب تک اپنا رہی ہے کہ یہ انسان کے نفس اور لطیفۂ نفس کی سطح سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس طرح انسان نے سنتِ الٰہی یا قوانینِ قدرت کا پابند رہ کر نفس سے لطیفۂ نفس کی سطح تک ضرور رسائی کر لی لیکن آگے کے مقامات ان ہی کو عطا ہوئے جنہوں

نے فضل ربّی سے، عشق کے انداز کو اپنایا اور عیسوی اسلام کے صحیح معنوں میں علم بردار ہوئے، یہاں تک کہ عالمِ ملکوت تک رسائی کر لی۔

مادّی دنیا میں اس عشق کا پرتو مختلف انداز میں ظہور پذیر ہے۔ اجسام کی حد تک یہ کشش کے انداز میں ہے جیسے کشش ثقل، برق، مقناطیسیت وغیرہ اس کشش کا اظہارِ توانائی نباتات میں زیرگی کی صورت میں ہے یا تنے کی روشنی کی طرف کشش اور جڑ کی زمین اور پانی کی طرف۔ حیوانی زندگی میں یہ کشش، نسبت مادری اور زوج کی شکل میں ہے۔ پھر جان کے ساتھ اسی شہوانی کشش کا تعلق قائم ہو کر تولید، نمو، ارتقاء کی شکل بن گئی ہے۔ حرکت اس تعلق کا اظہار ہے اور اسی کو زندگی کہا جاتا ہے۔ وہ زندگی جسکی بنیاد حبُ ہے، نمو ہے، فروغ ہے، ارتقاء ہے، اور فطری طور پر ہر حیوان میں ہے۔ انسان اگر نفسانی سطح پر زندگی گزار دے تو یہی حبُ، حیوانوں کی سطح سے بالاتر نہیں ہو پاتا لیکن عقل و فہم کے سہارے اگر اسے باشعور اور تہذیب یافتہ کرے تو لطیفۂ نفس تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ یہی شریعت ظاہر کی حد ہے البتہ جس کی محبت کو تہذیب ملی۔ جس نے اپنے کو نفسانی سطح پر گرے رہنے سے بچایا۔ جس کی محبت عشق کی بھٹی میں کھری ہو کر نکلی اسے مقامِ قلب ملا۔ قلب کی دنیا کے لطائف، نہ جمادات کو نصیب ہیں، نہ نباتات اور حیوانات کو۔ یہ شرف انسان ہی کو حاصل ہے۔ کہ اس میں اچھے برے کی تمیز ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسی لئے جس نے قلب کو عشق کی روشنی سے منور کر لیا، اسی سے صفات حمیدہ کا اظہار ہونا شروع ہوا۔ جیسے بے لوث خدمت، ایثار، قربانی یہ طریقت کی راہ ہے۔ مَوْتُوْقَبْلَ اَنْتَ مَوْتُو کا مقام ہے، عیسوی منزل ہے پھر جب اٹھالیا گیا تو مقامِ روح میں پہنچا۔ اور رحمتوں سے نوازا گیا۔ حقیقت کی راہ میں قدم رکھا۔ مقامِ محمدیؐ کی جانب گامزن ہوا۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ آخر شریعت کی سختی سے پابندی کرنے اور کرانے میں انسان خود محبت سے کیسے محروم رہ گیا۔ طریقت و حقیقت کی راہ سے کیسے دور ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ ظاہرداری سے ارکان ادا کر لینا ایک خاص قسم کے جھوٹے اعتناع میں انسان کو ڈال دیتا

ہے اور اپنے کو دوسروں سے بلند و برتر نہ صرف سمجھنے ہی لگتا ہے بلکہ منوانا بھی چاہتا ہے۔ عاجزی، مسکینی، اللہ پر متوکل رہنے کی عادت، کبھی کی چھوٹ چکی ہوتی ہے۔ حالانکہ راہِ حق میں جب تک نیازمندی نہ ہو، محبت کا انداز کہاں سے آئے۔ محبت بھی ایک عطائے الٰہی ہے جو دل شکستہ لوگوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ جب تک خالق کے آگے دل کی شکستگی پیش نہ ہو اس کی مخلوق کے آگے محبت کا انداز کہاں سے آئے۔ کیسی اچھی مخلوق اور کیسی بُری سب کے ساتھ ایک جیسا خلوص کیونکہ حق تک رسائی کا مادّی ذریعہ بس یہی مخلوق تو ہوتی ہے۔ لہٰذا جب مخلوق کے ساتھ محبت کا انداز ہی نہ آپایا تو مقامِ قلب تک رسائی کہاں سے ہوتی! عیسوی اندازِ اسلام کہاں سے آتا! جب تجسّس حقیقت کے لئے لگن اور لو نصیب نہ ہو سکی تو براہیمی اندازِ اسلام کہاں سے آتا! صرف ظاہرداری سے قوانینِ مذہب کو پکڑ کر موسوی اندازِ اسلام کا دھوکہ ہی لوگوں کو دیا جا سکا۔ نہ وہ اندازِ کلیمی نصیب ہوا، نہ تجلّی طور نہ علم لدّنی، نہ عصا و یدِ بیضا کی حقیقت۔ گویا اس طرح دین کی روح ختم ہو گئی اور ظاہری ڈھانچے کو دکھا کر، حق کے پرستار اپنے کو طفل تسلیاں اور دوسروں کو دھوکہ دیتے رہے۔ صداقت سے اپنا حساب خود لے کر اب ہر ایک کو دیکھنا ہے کہ ہمارا اندازِ بندگی کیا ہے۔ یومِ حساب کا کیا انتظار کرنا۔ حق کے اظہار کے اپنے باطن میں بھی تو انداز دیکھیں۔ اپنی طرف بھی تو نظر کریں اور یہ بھی تو دیکھیں کہ ہماری نظر اور اُس نظر کے درمیان جو حضرت علیؓ نے کہی تھی کتنا بعد اَلْمُشْرِقَیْنِ وَ الْمَغْرِبَیْن ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسه فَقَدْ عَرَفَ ربّه اپنے عرفانِ باطن ہی کا ذکر ہے۔ ہم اپنا عرفانِ ظاہر ہی کر کے دیکھیں تو اپنے فریبِ دگراں اور خودفریبی کا پردہ چاک ہو۔ یہ تو ابھی اپنے ظاہری عقل و ہوش و ادراک کی سطح ہے، نفس کی سطح ہے جہاں خرابی نظر آتی ہے۔ اس سے آگے قلب کی دنیا ہے۔ یہ محبت و مستی کی دنیا ہے۔ دل کا رنگ آنکھوں میں بس جانے کی دنیا ہے۔ جنہیں اس کی ہوا بھی نہیں لگی وہ عرفان و سلوک کیا جانیں! وہ منازل روح، سرّ، خفی، اخفا اور ان سے آگے غیب ھو کا ذکر بھی کیا کریں۔ ادھر اسلام عالمِ امر میں قدم رکھنے کا سبق دے رہا ہے۔ اور ہم اس عالمِ امر میں قدم رکھنے سے اپنے کو محروم سمجھیں تو تدبیر کی کوتاہ دستی ہے۔

جن قوموں یا جن افراد نے اپنی زندگیوں میں اس راز کو پا لیا وہی آئندہ زمانہ میں

محمدیؐ اسلام قولِ فیصل کی علم بردار ہو جائیں گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا پرچم اب بظاہر نام لیوا مسلمان سے چھن کر ان افراد اور قوموں کو عطا ہو گا جو اسلام کی اسپرٹ اور اس کے فروغ کے انداز میں حقیقتِ اسلام کو اپناتے جائیں گے۔ مشیتِ ایزدی نظر آ رہی ہے کہ موجودہ نام لیوا مسلمان کو اپنا طرز بدلنا ہو گا پھر کہیں وہ گلُ پیدا ہوگا، جو اسلام کی خوشبو بن کر پھیلے گا۔ جن قوموں کا نصب العین فروغ ہے، انہیں اللہ اپنی رحمت سے نوازے گا۔ شمالی چینیوں، حبشیوں، سرحدی قبائلی پاکستان اور جنوبی ہند کے موپلاؤں جیسی قوموں کی قسمت اسلام کی آئینہ داری کر رہی ہے۔ ان کو ابھی تہذیب نے اپنی گندگی سے خراب نہیں کیا۔ ان فروغ والی قوموں میں حیائے انسانی، جوشِ عمل، سادگی اور خلوص ہے۔ ان میں جمعیّت بندی اور مل جل کر کام کرنا اصولی طور پر رائج ہے۔ اب اگر یہی عمل، خلوصِ نیت اور دلی ہمدردی کے جذبہ میں ہو تو یہی تو اسلام کا پہلا سبق ہے۔ پھر یہی جذبہ، محبت، خلوصِ دل سے ہمدردی بنی نوع انسان بن کر ان کی خدمت کے لئے وقف ہو جائے تو یہی رحمت کا انداز بن جاتا ہے۔ اسلام اسی سطح سے تو رحمت بن جانے کا سبق دیتا ہے۔ قلب کی گہرائی سے ہمدردی انسانی کا سبق اور کوئی مذاہب نہیں دیتا، اگر دیتا بھی ہے تو صرف انفرادی سطح تک ہی اور اپنی عاقبت کی خاطر۔ دوسرے مذاہب میں غریبوں کو امیدیں ضرور دلائی گئی ہیں مگر اس طرح غریبوں کو کلیجہ سے کس نے بھی نہیں لگایا کہ اے اللہ مجھے غریبوں ہی کے ساتھ رکھ، غریبوں ہی کے ساتھ مجھے مار اور غریبوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر۔ پھر رحمت اللعالمینؐ انداز میں فرمانا کہ گنہگار میرے، گویا بھٹکی ہوئی انسانیت کیلئے امید کی نئی راہ کھول دی۔ موجودہ اسلام کے نام لیواؤں کو اگر زندہ رہنا ہے تو یہی سبق دہرانا ہے۔ اپنی انفرادیت سے نکل کر جمعیّت میں پھیل جانا ہے۔ پھر جمعیّت کو عالمِ انسانی میں۔ لیکن موجودہ مسلمان اگر اپنی اپنی تکالیف، اپنی اپنی تنگ دستی، اپنے اپنے شکوہ شکایت، اپنی اپنی فکروں میں گھرے رہے تو رحمت کیسے آئیگی! رحمت کو پانے کیلئے یہ رنگ اختیار کریں کہ ہر دکھ درد میں اپنے کو اور بھی زیادہ محبوب سے قریب تر پائیں۔ قصیدۂ بردہ شریف جذام کی بیماری میں لکھا گیا۔ یہ آج بھی بیماریوں کی شفاء کا اثر رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ اپنی صحت کیلئے دعا نہیں ہے بلکہ محبوب کی حمد و ثناء ہے۔ اسی طرح کربلا کے میدان میں

بیمار حضرت زین العابینؒ کی دعا بھی نعتِ محبوب ہے۔ اسلام نے یہی سبق سکھایا تھا کہ ہر حال ہر انداز میں نظر محبوب پر رہتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ہوتا یہ گیا کہ علم و تقدس کے جھول، درد و ظائف کے جھول، شرع و پابندی احکام کے جھول، مادہ پرستی، جاہ پرستی کے جھول، اور جہالت، افلاس، تنگدستی، تنگ نظری، شقیق القلبی وغیرہ نے قوم کو ایسا گھیرا کہ اس میں سے راہ ملنی دشوار ہو گئی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ دوسری قومیں تک اپنی انفرادیت سے نکل کر خلوص اور جمعیّت بندی میں قدم رکھ رہی ہیں، جو اسلام کا پہلا سبق ہے۔ ادھر مسلمان ہیں کہ اپنی انفرادی دین دنیا کی فلاح اور علاقائی تنگ نظری میں ایسے لگے ہیں کہ خلقت سے رابطہ ہی کھو بیٹھے ہیں، پھر خالق سے رابطہ قائم ہو جانے کا سوال ہی کیا! ایک چھوٹی سی مثال خلوص کی لیں کہ ایک جانور تک کے ساتھ رفتہ رفتہ کیسی محبت ہو جاتی ہے۔ جانور تو پھر جاندار ہے ایک بے جان چیز تک کے ساتھ رابطہ اور لگاؤ رکھنے سے اس کی محبت ہو جاتی ہے۔ محبت اور خواہش کا جذبہ سب میں ہے بس فرق اسی میں ہے کہ رخ اس محبت کا کس جانب ہے۔ اگر یہ محبت صرف اپنے لئے ہے تو یہ نفسا نفسی اور خود پرستی و خود فریبی ہے اور اگر دوسروں کیلئے ہے تو احسان ہے۔ حق کی طرف قدم ہے۔ دوسروں کی طرف خلوص اور محبت سے رجوع ہونا بغیر اثر کئے نہیں رہتا۔ ننھے پودوں تک پر تجربے کر کے دیکھے گئے ہیں تو ایک جیسی حالت میں رکھ کر جن پودوں کے پاس بیٹھ کر خلوصِ قلب سے برکتوں کے لئے دعا کی گئی ہے تو وہ پہلے اُگے اور بڑھے۔ جب خلوص کا اس حد تک مادّی اثر ہو سکتا ہے تو محبت اور اس سے اوپر، روحانی اثر سے کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر جب یہ محبت اور روحانی اثر جانداروں اور انسانوں پر ہو رہا ہو تو اس سے بہتر معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضور نبی کریمؐ نے اسی لئے معجزہ کو اہمیت نہیں دی بلکہ محبت اور حُسنِ خلوص سے اخلاق کو لوگوں تک پہنچایا اور ان کا تذکیۂ باطن کیا۔ اسی سطح سے اسلام کی تبلیغ ہوئی اور بعد میں آنے والوں نے بھی باطنی تبلیغ و اصلاح کی طرف ہی زور دیا نہ کہ صرف کتابی علم و فہم دے کر اپنے دل کو تسلی دے کر بیٹھ رہنے کہ ہم نے پیغام پہنچا دیا۔

اب دیکھنا ہے کہ اسلام جس کا مقصد ظاہر و باطن کا فروغ تھا، ابتلاء میں کیسے پڑ گیا۔ ابتلائے اسلام کی بنیادی وجہ یہودیت ہے یہودیت مذہب کا نام نہیں بلکہ نسل کی گہرائیوں میں

جڑیں پکڑے ہے۔ علم الحیوانات سے ثابت ہے کہ یہ نسلی جڑیں ستر سال بھی نہیں کٹ سکتیں۔ فطرتِ انسانی میں لاشعور کے حافظے میں کچھ ایسی چیزیں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ کہ وہ نسلاً بعد نسلاً بھی ان خصوصیات کو برقرار رکھتی ہیں۔ اور شعوری طور پر شاید انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہودیت، برہمنیت اور کچھ اور انسانی طبقوں اور خاندانوں میں چند ایک نسلی خصوصیات ایسی چلی آ رہی ہیں کہ ان پر نہ مذہب اثر پذیر ہو سکا نہ کوئی فاتح اپنی نسل پر فخر ان خاندانوں اور قوموں کے خون میں شامل ہے۔ وہ خواہ کسی حالت میں ہوں، کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں دنیادار ہوں یا دیندار یہ نسلی غرور ان میں اس حد تک ہے کہ مختلف مراعات، خصوصی برتاؤ، انعام و اکرام کا صرف اپنے ہی کو مستحق سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ یہ ان کا پیدائشی حق ہے۔ یہ نسلی غرور اتنا ہے کہ شکریہ تک کے الفاظ کی ان کی روزمرہ گفتگو میں گنجائش ہی نظر نہیں آتی۔ ہر نفسی تسلی اور حصول کی خاطر یہ اپنے کو اس حد تک اہل سمجھتے ہیں کہ جیسے خدا بھی اپنے انعام و اکرام ان کے مقابلے میں دوسروں کو نہیں دے سکتا۔ مذہب کا جہاں تک تعلق ہے مذہب کے رسوم کی سختی سے پابندی کرنا، کرانا ان کا شیوہ رہا ہے۔ مذہبی کتابوں کی تقدیس کرانا اور ان کی تعلیم دینا، انکا دینی فریضہ رہا ہے۔ یہودیوں نے اس میں خصوصی طور سے دوسروں پر سبقت لی ہے۔ یہودا انکا خدا ہے اور یہ یہودا کے لوگ، دوسرے انسانوں سے ممتاز۔ یہودی عالموں نے دینی علم کا یہ انداز اختیار کیا کہ نہ صرف اپنے مذہب بلکہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کو پڑھا، ان کے ترجمے کئے تفاسیر لکھیں۔ عیسائیت اور اسلام کی کتب آج بھی ان کی اس اثر اندازی سے پُر ہیں۔ قرآنِ کریم کے تراجم میں بھی یہودیوں نے کافی حصہ لیا ہے اور خصوصی طور سے ان لوگوں نے جنہوں نے اسلام کو قبول کر لیا تھا مگر منافقت کے طور پر، تاکہ اندر اندر اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ ایسوں ہی کی شہ پر کئی ایک نبوّت کے دعویدار بھی ہوئے اور بعد میں آنیوالے زمانوں میں کئی فرقوں کے مذہبی پیشوا بھی بنے۔ یہودیت کے اس اثر کو مٹانا اب تقریباً ناممکن ہے۔ غور طلب بات ہے کہ ہٹلر نے اگرچہ ایسا نظام قائم کیا جس سے کوئی بچ نہ سکتا تھا۔ مگر یہودیوں کو اس نظام کے ذریعہ بھی بدلنے کا اس نے امکان نہ دیکھا، کیونکہ یہ نازی طبقہ میں بھی شامل ہو کر، اندر ہی اندر رخنہ اندازی کرتے اسی لئے اس نے ان کے

مٹانے کی ہی سوچی۔ مگر شیطان یا نفس کو مٹانے کے معنی ہی نہیں ہوتے۔ البتہ اس کو تہذیب دی جاسکتی ہے اور مسلمان کیا جاسکتا ہے۔ نفس کو تہذیب میں لانا، کل کی میزان قائم کر کے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ میزان قائم کرنا اسلام سکھاتا ہے۔ مگر اس کے نفاذ کیلئے بڑے ریفارمر اور پُرخلوص جماعت کی ضرورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قدرت اپنے قانون کے تحت ہر مضر شے کو مفید سے بدلتی ہے۔ یہی حال چند صدیوں میں اس یہودیت کے شجر کا ہوگا۔ چونکہ یہودیت شجرِ طیبہ کے تنے کی لائن میں نہیں ہے جہاں قدرتی توازن ہے۔ اس لئے اس کی شاخیں پھیل پھیل کر خود قانونِ فطرت کے تحت ختم ہو جائیں گی۔ کیونکہ جب تک نفس و قلب و روح میزان میں نہ ہوں۔ نہ ہی ثبات مل سکتا ہے، نہ دین فطرت تک رسائی ہوسکتی ہے۔ نفس کی سطح تک رہ جانے کے باعث یہودیت کی نظر اعلیٰ مدارجِ اِنسانیت کی طرف اٹھتی ہی نہیں۔ نفس کی سطح پر سوائے بغض، فساد، نفاق اور شیطنیت کے کیا ہے! اسی کا سبب ہے کہ آج تک مختلف انداز میں یہودیت کا اسلام پر حربہ جاری ہے۔ آج بھی جو تفاسیر، تراجم، تواریخ مختلف مذہبی کتابوں اور زمانوں کے ہیں۔ انہیں غائت نظر سے پھر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مگر اب یہ اتنا مشکل کام ہے کہ ہر مفکّر کو اپنے علم تک کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ علم کے تمام جنجالوں کو خود اپنا نکتہ چیں بن کر صاف کرنا ہوگا۔ فیضِ نبوت سے ایمان اور ایقان کی روشنی ہی میں یہ کام ممکن ہو سکے گا کیوں کہ اغیار کی صدیوں کی لگاتار کوشش اور فراستِ یہود کا مقابلہ کرنا، اب عقل کی سطح سے نہ ہو سکے گا۔ مومن کا قلب اور روحانی سطح ہی ایسے ہیں کہ وہاں دھوکہ کی نہ گنجائش ہے نہ اس سطح پر کوئی دھوکہ کھا سکتا ہے۔ یہ عشقِ نبیؐ کی وارفتگی کا انداز ہے جو صحابۂ کرام کو حاصل تھا۔ ہر کلام اور ہر انداز کا منبعِ فیضان ان کیلئے حضورؐ انور کی ذاتِ مبارک تھی۔ اور یہی تبع تابعین اور صالحین کا انداز رہا ہے۔ لہٰذا اسی در تک رسائی کرنی ہے۔ عقل کی سطح پر نہیں بلکہ قلب و باطن میں۔ عقل کی سطح پر حاصل کئے ہوئے علم نے تو اب اتنی پختگی حاصل کر لی ہے کہ اپنے دین اور اپنی تاریخ میں حوالے بھی دئے جاتے ہیں تو ان ہی کتب اور ان ہی تراجم کے جن کے پیچھے تمام تر یہودی ہاتھ ہیں اور جن کے پیچھے عیسائیوں اور برہمنوں نے بھی کیا کچھ نہیں کیا۔ آج ٹائن بی اور ہٹی اسلامی تاریخ کے ماہر مانے جانتے ہیں اور یہ یہودی ہی تو ہیں۔

ان کا ذہنِ رسا، اتنی لطافت سے واقعات کو بیان کر جاتا ہے کہ ان سے انکار کرنیوالا آج جاہل ہی قرار دیا جائیگا۔ یہی لوگ کیا۔ سینکڑوں یہودی، عیسائی، ہندو ایسے گزرے ہیں جنھوں نے طرح طرح سے اثر اندازی کرکے کبھی دین کی حقیقت کو سامنے ہی نہ آنے دیا اور بیشتر مذاہب کا یہ حال کر دیا کہ آج ان کے پیرو، جان مذہب سے علیحدہ ہوکر سطحیّت میں گرفتار ہیں یا مذہب سے ہی روگرداں ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کو اپنے سے بہت بلند ہوکر یہ دیکھنا ہے کہ ہم خود جان، مذہب، ربطِ ملت، رابطۂ خدا و رسول سے کتنا علیٰحدہ ارکانِ دین کو کئے ہیں۔ روحِ دین، مغزِ قرآن، عشقِ نبی، کہاں تک ہمارے قلب و روح میں سمائے ہوئے ہیں!

الغرض یہودیوں اور برہمنوں کی فراست کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہی ہے کہ حقیقتِ دین سے علیحدہ کرکے، ظاہر پرستی، اور آئین و رسوم، تواریخ و علم تحقیق وغیرہ میں ایسا پھنسایا کہ فرقے فرقے ہوگئے۔ تجسّس و عشق و وجدان و عرفان کا تخیل تک اپنی دین کی پابندی میں نہ رہا۔ خشک مولویت کی بنیاد یہی یہودیّت کی فتنہ پردازی بن گئی۔ یہاں تک کہ سطحی شرع اور یہودیت میں کوئی تفریق ہی نہ رہی، اپنے دین میں اسی یہودیّت سے قوم کو بچنا ہے۔ رحمت اللعالمینی وسیلے سے ہی اس ابتلاء سے علماء اپنے کو بچا سکتے ہیں۔

یہودی فراست کا یہی حال اور اس سے کہیں زیادہ، معاملاتِ دنیوی میں رہا ہے۔ اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ گو یہ لوگ حکومت سے اکثر محروم رہے لیکن دوسرے مذاہب اور حکومتوں میں دخل اندازی سے باز بھی نہ آئے۔ مغرب کی آج بیشتر حکومتیں یہودی تاجروں اور سرمایہ داروں کے اشاروں پر چل رہی ہیں۔ اور بعض صورت میں اتنے حُسنِ لطافت سے کہ اپنے ہی حُسنِ خودفریبی میں بہت سے ممالک گرفتار ہیں۔ روس کی نئی کمیونسٹ حکومت کی روش یہودیوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ اس لئے کہ یہودیت نے گویا عیسائیت سے اس طرح بدلہ لے لیا۔ یہودیت کا سب سے قابلِ فخر کارنامہ یہ ہے کہ دنیا میں یہ قوم کسی سے پیچھے نہ رہی۔ جو بھی پیشہ انہوں نے اختیار کیا۔ اس میں دماغی رعنائی برابر رہی اور بلاوجہ بھی نہیں۔ ان ہی میں بہترین مغنی، بہترین موسیقار، بہترین عالم، بہترین تجّار،

بہترین سائنس دان پیدا ہوئے۔ یہ ذہنی عروج آخر اس قوم میں کیسے آیا! ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ فراعینِ مصر نے بھی انہیں چار سو سال مصر سے نہ نکلنے دیا۔ کہ بہتر دماغ والے بہتر کاریگر، بہتر کام کرنے والے یہی تو تھے۔ محکوم ہوتے ہوئے بھی مختلف قوموں اور حکومتوں کی زندگی میں تہذیب کے علم بردار یہی رہے، اس لئے قدرتی طور پر اُنہیں غرور آنا تھا۔ نسلاً بعد نسلاً یہ غرور ان کے خون ہی میں شامل ہو گیا اور اس کی جڑیں ہزاروں سال گہری ہو گئیں۔ جو یہودی مسلمان بھی ہو گئے انہوں نے لاشعوری طور پر اپنے توہّمات اور ظاہر پرستی اسلام میں داخل کر دی۔ اب دیکھنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ یہودیوں، برہمنوں اور اسی قسم کے فرقوں میں نسلی امتیاز کا غرور کس طرح برقرار رہا۔ ایک بات جو سب سے زیادہ روشن ہے یہ ہے کہ کوئی دوسری نسل والا نہ برہمن ہو سکتا ہے، نہ بنی اسرائیل میں شمار ہو سکتا ہے۔ اس طرح باہر کے خون کو اپنے خون میں شامل ہونے سے ان قوموں نے دوسروں کو روکے رکھا ہے اور ان کا نسلی امتیاز صدیاں گزر جانے پر بھی برقرار ہے۔ نہ صرف نسل بلکہ مذہب تک میں ان لوگوں نے یہ احتیاط رکھی کہ دوسری قوم والا نہ برہمن بن سکا، نہ یہودی مذہب میں لیا گیا۔ اس طرح ان کی امتیازی انفرادیّت برقرار رہی۔ سوچیں تو یہی تو نفس کی سطح ہے کہ اپنی ''میں'' کے علاوہ دوسرے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ شیطان نے بھی یہی کیا کہ جہاں دوسرے آدمؑ کے آگے جھک گئے، اس نے اس بات کو نہ مانا کہ خدا کے ساتھ جو اس کی خصوصی نسبت چلی آ رہی تھی، اب اس میں کوئی دوسرا اس سے سبقت لے جائے۔ غالباً یہی سبق تھا جو دانستہ طور پر اس نے حضرت موسیٰؑ کی قوم کو ودیعت کر دیا۔ اور یہی اپنی خود پرستی کی وجہ تھی کہ یہودیوں نے باوجود اس کے کہ حضرت عیسیٰؑ ان ہی کے قوم کے تھے، حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلایا اور ان کو نبی نہ مانا۔ علمائے دین، اپنی انانیّت میں، دنیا و دین کے ظواہر رسوم میں ایسی گرفت مضبوط کئے ہوتے ہیں کہ ان میں غرورِ شخصیت، جس کی بنیاد شیطانی ہے مضبوطی سے گھر کئے ہوتی ہے کہ نفس کی سطح پر رہنے والے انسانوں میں یہ بات لابدّی طور پر سرائت کر جاتی ہے کہ ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں، یہی پردہ ایسے افراد میں نسلاً بعد نسلاً قائم ہو جاتا ہے۔ 'میں' کے علاوہ ان کی نظر ہی نہیں اٹھتی عروجِ باطن ایسی حالت میں کہاں سے نصیب ہو! رجوع الی اللہ کیوں کر ہو! یوں کائنات

کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی جانب رخ کئے ہے، اسی کی تسبیح میں ہے۔ مگر لاشعور کے لاشعور یا باطن کی حد تک ہی۔ مگر انسان کو شعور و فہم عطاء ہوا ہے۔ اس شعور کو اگر تربّیت الی الحق نہ ملے تو پھر صرف نفس و عقل اور اپنی میں، کے چکر میں گرفتار رہ کر زندگی گزرتی ہے۔ اور اگر فیضِ نظر سے باطن کی کھڑکی کھل گئی تو انسان اپنے مدارجِ اعلیٰ کی جانب رُخ اختیار کرنے لگتا ہے۔

حیاتِ عالم پر نظر کریں تو امرِ ربّی ہر سطح پر کارفرما ہے، کیا جمادات و نباتات، کیا حیوانات و انسان، یہ امرِ ربّی اسلام کیلئے قرآن کی صورت میں کُن کا پیغام ہے۔ اسی لئے جاوداں ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

این کتابے نیست چیزے دیگر است

کسی کلام کے جاوداں ہونے کیلئے اس کے مقصد، مخرج اور منتہیٰ پر نظر رکھنی ہوگی۔ حیاتِ عالم میں پیام و کلام کی کارفرمائی دیکھنے کے لئے حیوانی زندگی پر نظر کریں تو فطری جبلّت، یہاں کارفرما ہے۔ اس کا تعلق تحفظِ نسل سے ہے۔ کئی نسلوں تک کوئی حیوانی ضرورت یہ صورت اختیار کر لیتی ہے کہ نسلی یادداشت کے طور پر ذہن میں اسکا لاشعور سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دھماکے سے انسان لاشعوری طور پر چونک اٹھتا ہے۔ بطخ پانی میں ڈبکی لگا لیتی ہے اور سمیرع خطرہ کے وقت اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے۔ گویا جانداروں کی سطح پر عقل اسی فطریِ جبلّت کے مطابق سوچتی ہے اور عمل کا ظہور ہوتا ہے۔ اس سطح پر ذہن و عقل کا انداز اس فطری جبلّت کو ہی حقیقت سمجھتا ہے۔ البتہ باشعور انسان اپنی ذہانتِ خداداد سے یا حاصل شدہ علم، احساسات اور تجربات کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب تک مادّی تجربہ سے (آفاق سے) تائید نہ ملے اسے حقیقت نہ مانو۔ یہ سائنس کا اصول ہے۔ یہ عقل و فراست کا میدان ہے۔ امرِ خداوندی کے تحت عقل و فراست کی مختلف سطحیں ہیں۔ ایک شعوری ہے جو احساسات کے ذریعہ تربّیت پاتی ہے۔ حواسِ خمسہ اس عقل کی پرورش کرتے ہیں۔ ایک لاشعوری ہے جو فطری جبلّت اور حواس کے ذریعہ حاصل شدہ علم سے ترکیب پاتی ہے۔ گویا دماغ کے اندر جو نسلی اور جبلی یاداشتیں ہیں اور حاصل شدہ علم کی یادداشتیں ہیں ان کا

لاشعور سے تعلق ہو جاتا ہے، اب یہی انسان، بغیر شعور و عقل کی سطح کے ایسے عمل کر گزرتا ہے جس کا خود اس کی عقل کو علم نہیں ہوتا اور کوئی ماہرِ نفسیات ہی اس گتھی کو سلجھاتا ہے۔

عقلِ انسانی کی ایک سطح ہے جسے چھٹی حس کہہ لیں۔ اس کی اعلیٰ سطح فراستِ مومن ہے۔ اس کا شعور سے بھی تعلق ہے، لاشعور سے بھی اور ممکن ہے روح سے بھی ہو۔ اسی کے طفیل امور دنیوی میں اعلیٰ کارکردگی، اعلیٰ انصاف وعدل، اعلیٰ معاملہ فہمی اور دانشمندی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ اسی کا ایک انداز القاء ہے۔ جو حیات و روح کی برزخ سے لاشعوری وابستگی معلوم ہوتی ہے اور شعور اس سے فیضان حاصل کرتا ہے۔ یہاں سوائے رحمت کے دوسری بات نظر نہیں آتی۔ اسی القاء کے طفیل ذہنِ انسانی میں ایسے خیالات کی خود بخود آمد ہوتی ہے جنہوں نے نئے اندازِ حیات انسان کو عطاء کئے۔ دیوانِ غالب اور دید کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ اسی سطح سے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں سب سے زیادہ القاء کا فیضان اڈیسن کو نصیب ہوا۔ دین کے راستے میں اور باطن کی راہیں کھل کر کلام حق کے فیضان کا مختلف مجدّد دین اور صوفیائے کرام نے ذکر کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس القاء کیلئے ساری شخصیت کو انہماک و فکر کی شدّت سے رخ ملا ہوتا ہے۔ اور اسی حالت میں اللہ کی رحمت کارفرما ہوتی ہے۔ یہ رحمت کا انداز محسوس کرنے کی بات ہے، عقل کی دسترس سے باہر کی بات ہے اور اپنی کوشش کی بھی وہاں تک کوئی رسائی نہیں کیوں کہ یہ اُدھر سے ہے۔ اور اس کے فضل پر منحصر ہے رحمت کے ذریعہ القاء ہونا، اتفاق کی بات نہیں۔ یہ عقل کی کوتاہ دستی ہے کہ جب خود کسی گتھی کو سلجھا نہ سکی اور عاجز ہوئی تو اسے اتفاق یا تقدیر کہہ دیا۔ حالانکہ تقدیر تو مقرر ہے، اپنی صلاحیتوں کا بیان ہے جو حق کی طرف سے اس وجود کو عطا ہوئی ہیں۔ اور تدبیر کی سطح، اپنی عقل تک ہے۔ تقدیر عقل و آگاہی سے پرے ہے۔ رَحْمَتِیْ وُسِعَتْ کُلَّ شَیءٍ کی سطح پر ہے۔ القاء اور آگہی کا انداز خود بخود ہے۔ جیسے کہ اپنے آپ میں ہے، اپنے آپ تک ہے۔ اس میں دوائی نہیں۔ اس کی معراج خود آگہی۔ یہاں رحمت ہے، نزولِ انوار ہے لقائے حق ہے۔

القاء کے آگے پیام و کلام کی صورت وحی ہے، حدیث قدسی ہے اس وحی کی مختلف

سطحیں ہیں اوپر کی منازل میں وحی ایک خاص اکرام ہے انبیاء کے اوپر یہ کلام و پیام ہے باری تعالیٰ کا اور صرف انبیاء تک محدود ہے جن کی فطرت میں معصومیت ہے۔ اس طرح انبیاء کی فطرت دیگر عالمِ انسانی سے ممتاز قرار پائی۔ یہی اللہ کی عصمت کے حقدار ہیں اور تحفظِ کلام کے ضامن کہ گفتِ الٰہی میں کسی قسم کا دخل ان کی فطرت معصوم کی وجہ سے ممکن ہی نہ تھا۔ وحی کا سلسلہ اب منقطع ہے، کلام کی تکمیل ہو چکی۔ مگر حدیثِ قدسی کا سلسلہ جاری ہے۔ حدیث قدسی اللہ کا انعام ہے صالحین پر۔ اس کا عطیہ ان وجودوں پر ہے جنکی روحیں توحید ذاتی میں ہوتی ہیں۔ ان پر جو القاء ہوتا ہے اسے حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔ اس کا تعلق قدّوس کے رابطے سے ہے۔ یہ ادھر سے ہے۔ کسی وجودِ صالح کو جب توحید ذاتی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر عقلِ کل سے براہِ راست اس کا رابطہ ہوتا ہے۔ صوفیا نے یہ رابطہ قائم کرنے کیلئے مختلف طریقے متلاشیانِ حق کو بتائے ہیں۔ جیسے ذکرِ خفی کہ اس سے قلب کو سکون ملتا ہے۔ ذکرِ خفی عشق کی یاد کی تڑپ ہے۔ حیاتِ روح ہے، عطاء ہے۔ اور پاس انفاس شدّتِ عشق و تجسّس ہے، حقیقت کا انداز ہے، اس میں روح کو بھی سکون ملتا ہے۔ یہ عقل سے یاد، یا سوچنا، یا تکرارِ ورد و کلام نہیں بلکہ اپنے باطن، اپنے اندر کو سکون میں لانا ہے۔ اس کی ریاضت سے تار سے تار ملتا ہے، رابطہ قائم ہوتا ہے۔ ایسے کا ذہن و عقل بھی اب ادھر سے رابطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ رابطہ ایسا ہے جیسا کہ اوپر کی منازل میں روح کا رابطۂ روحِ اعظم سے ہو جاتا ہے اور اپنی صفات کا مجرّدات سے۔ جب پاس انفاس کے ذریعہ باطن کو سکون مل جاتا ہے تو عقلِ ظاہر اور حواسِ خمسہ کے چکروں سے رہائی ملتی ہے۔ باطنی نظر شروع ہوتی ہے۔ خیالاتِ حُسنہ، لطائف اور انوار حاصل ہوتے ہیں مگر ان سے بھی گزر جانا ہے۔ کیونکہ، ان لطائف ان انوار کی بنیاد بھی مادّی اور وجودی ہے۔ ہم خود جو وجود میں ہیں۔ اس لئے ذہن اور حاصل کردہ علم کے ملنے سے یہ اشکال بنتی ہیں۔ حقیقت ان سے پرے ہے۔ یہ طریقت کی راہ سے بھی دشوار ہے۔ بقول حضرت لعل شہباز قلندر

ع حقیقت لنگر آں دارد زراہِ فکر دشوار است

حقیقت کا سفر رحمت کے سایوں میں ہے۔ یہ اُدھر سے ہے اپنی کوشش کو اس میں دخل نہیں۔ یہ

حقیقتِ محمدیؐ سے رابطہ ہے۔ یہاں نسبتِ محمدیؐ کارفرما ہے۔ بغیر پیرِ کامل کے وسیلے کے یہاں قدم رکھنے کی گنجائش نہیں۔ یہ فنا در فنا کے بعد مقامِ بقاء ہے۔ لقائے محمدیؐ ہے **نور السموات** والی بات ہے حضرت اویس قرنیؓ نے نہ صورت دیکھی، نہ آواز سنی اور انوارِ نبوت ان پر کھل چکے تھے۔ عاشق کی منازل پر غور کریں کہ دیکھنے کی تڑپ، شدّتِ تلاش، تجسّس در در لئے پھرتی ہے۔ پھر دیکھ لیا اور عشق نے بھسم کر ڈالا اور الطف ہوئے، دیکھا بھی نہیں، یار غائب ہی رہا، صرف آواز ہی سن لی اور مر مٹے۔ پھر جب الطف در الطف ہوئے تو نہ دیکھا، نہ آواز سنی، بس فدا ہو گئے۔ رحمتوں کے سائے میں آ گئے۔ عین ہو گئے۔ **رحمتی وُسِعَت** کا انداز اپنا لیا۔ **الله نور السموات** کو پا لیا۔ آخر یہ ارتقائے باطن کس طرح ہوا۔ عقل اس گتھی کو کیسے سلجھائے۔ جانِ قرآن جانِ اسلام کو کیسے پائے۔

اب عام انسانی سطح پر نظر کریں۔ تاریخِ عالم پر نظر ڈالیں۔ انبیائے کرام کے واقعات سامنے رکھیں۔ ادیان عالم کے ارتقاء پر غور کریں پھر دیکھیں کہ تمام مذاہب میں اسلام کو جو افضلیت ہے وہ اسی بناء پر تو ہے کہ اسلام گزرے ہوئے مذاہب کا فطری ارتقاء ہے۔ یہ ارتقائے دین کچھ اس قسم کا ہے کہ فرد کی حیات سے اور حیاتِ عالم سے بھی اس کا تعلق ہے۔ حیات بعد الممات پر اسلام خصوصی طور سے زور دیتا ہے بلاوجہ بھی نہیں کیوں کہ یہ ارتقاء مرنے کے بعد بھی روح میں جاری ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی ادھر ہی کی زندگی کا ایک سلسلہ ہے۔ گویا روح کی زندگی ازل، ابد کے مابین ہے اور تمام تعیّنات سے ماوراء ہے۔ اس وقت تک جاری ساری ہے جب تک کہ روح کو روحِ اعظم سے رابطہ نصیب ہو اور حق، حق سے مل جائے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا، روح کا ارتقاء رحمتوں کے سائے ہی میں ممکن ہے اور امرِ ربّی کے طفیل ہی روح کی حیات ہے۔ نمو ہے، ارتقاء ہے۔ ''کُن'' کی یہ فطری محرکِ قوت روح میں ہے۔ جیسے وجود و زندگی نے اس سے رابطہ پایا۔ مقامِ روح پر ''کُن'' کی کارفرمائی عمل پیرا ہونی شروع ہوئی۔ قرآنِ کریم اس حیاتِ روح کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام اسی سطح سے، متلاشیانِ حق کو، حق کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسلام امن و سلامتی ہے۔ یہ امن و سلامتی، مرضیِ حکم الٰہی سے رابطۂ رحمت کے انداز میں ہے۔ عشق و محبتِ روحانی کا یہی صلہ ہے

واصل بالحق ہونے کا یہی انداز ہے۔ یوں دنیاوی اور مادّی سطح پر بھی اسلام کی رحمت کے نقشے دنیا نے بار ہا دیکھے۔ اس کی اس جگہ وضاحت غیر ضروری ہے۔ صرف دنیوی سطح ہی سے دیکھیں تب بھی اسلام ہی میں یہ سکت ہے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں یہی مذہب قائم رہے گا۔ اس کی تصدیق دنیا کے بڑے بڑے مفکرین نے کی ہے۔ برنارڈ شا اور برٹرنڈ رسل جیسے فلسفی، اسلام کی اس شان کو مان چکے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اسلام کے قوانینِ ظاہر میں بھی یہ گنجائش ہے۔ کہ ناموزوں حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی یہ قائم رہ سکتے ہیں۔ آج کل کے عالمِ اسلامی کی حالت زار سے یہ بات پھر بھی روشن ہے کہ باوجود پیرویانِ دین کی زبوں حالی کے، اسلام کے اصل اصول پر کوئی چوٹ نہیں پڑتی۔ آج اسلام کے پیرو نہ سہی، دوسرے لوگ ہی اسلام کے اصولوں پر کاربند رہ کر اپنی جمعیّت کئے ہیں اور دنیا سنوار رہے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے اسلئے فطری طور پر جو قومیں اسے اپنائینگی، فلاح پائینگی، رحمتِ عام ہے۔ حیاتِ عالم میں سلسلۂ کن رحمتوں کے سائے میں جاری ہے۔ رحمت کا لابدّی پہلو ہے کہ نقصان دہ کو ہٹا کر ان کی جگہ مفید وموزوں کو دیتی ہے۔ اس طرح خراب اور نقصان دہ ہٹ ہٹ ان کی جگہ تازہ اور اچھے وجود میں آ رہے ہیں۔ زندگی و حیات کی یہ شدّتِ رحمت، افرادِ عالم میں کتنی بڑی رحمت ہے۔ ایک جسم یا فرد یا قوم ختم ہوئی تو کیا، حیات تو رحمتوں کے سائے میں اپنی فطری سادگی اور تازگی کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔ اسلام فروغ کا نام ہے۔ ایک ایک نکتۂ اسلام سے یہ فروغ پھوٹ رہا ہے۔ جن قوموں نے بھی اس کو اپنا لیا وہی فروغ کی راہ پر گامزن ہو جائیں گی۔ اسلام کے نام لیوا پھول کی طرح کھل اٹھیں گے یہ تو صرف مادّی اور دنیوی سطح کی بات تھی۔ اسلام کا اصل میدان تو عالمِ امر ہے۔ روح کا مقام ہے۔ یہیں تو انسان خلیفتہ اللہ اور آمر باللہ ہے۔ صاحبِ کنٹ ہے۔ افسوس ہے کہ علماؤں نے اسلام کو صرف ظاہری موسوّیت کے انداز ہی میں پیش کیا۔ آئین وشرع کو مادّی پہلو تک ہی اپنایا۔ تجسّس و شوقِ براہیمی کو نہ اپنا سکے۔ علمِ لدُنی، اندازِ کلیمی جلالِ موسوی کو نہ پا سکے۔ عشق ومحبت کے انداز میں روح کے مقام تک رسائی حاصل نہ کر سکے جو عیسوی انداز تھا۔ اس طرح اپنے اصل اپنی حقیقت کی تڑپ سے نا آشنا رہے۔ جو بنیادِ وجود تھی اور صرف تراجم اور تفاسیر کو دین کی معراج

سمجھ کر ان ہی میں ایسے پھنسے کہ اس ذہنی اور عقلی سطح سے نہ خود اُوپر اٹھ سکے، نہ دوسروں کیلئے اسکی گنجائش چھوڑی۔ ظاہر ہے کہ ذہن کی اس محدود سطح تک سوائے تخیل کے جمود کے اور مادّی و ذہنی الجھنوں کے کیا نصیب ہوتا! یہاں فروغ کہاں سے نصیب ہوتا، تعجب تو یہ ہے کہ اس قوّتِ کُن، اس رحمت کا ذکر تک کسی نے نہیں کیا، البتہ ان اولیاؤں نے جن کا شرحِ صدر ہو چکا تھا۔ جن کے باطن کے چشمے کا منہ پھوٹ گیا تھا۔ وہ تو اس حقیقت کو اپناتے رہے۔ مگر ظاہر پرست اس سے محروم رہے اور بے نیاز بھی۔ ان ظاہر بینوں نے موسوّیت کا ظاہری جبہّ تو چڑھا لیا مگر باطن تک رسائی نہ کر سکے جہاں فروغ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ موسوی شریعت کی سطح تک دین میں قلب و روح کی واردات کہاں آئی تھیں۔ یہاں جاننے اور علم کا انداز کیا ساتھ دیتا۔ یہ تو ہونے کا انداز تھا۔ کسی کے فیضانِ نظر سے باطن کی راہ کھلنے کا نکتہ تھا۔ اسلام کا یہ عروجِ باطن کا نکتہ ہی اس کی تمام مذاہب پر فوقیت تھی۔ اسی بناء پر تو اسلام تمام مذاہب کی منتہا ہے اور پائندہ و جاوید ہے۔ رحمتِ عالم سے۔

نبیِ کریمؐ نے فتح مکہ کے بعد اور دیگر تمام جنگوں میں ظاہری اصولوں کیخلاف، رحمت کا انداز برتا۔ اسی لئے اللہ سلام بھیجتا ہے۔ ہم موقع ہی نہیں دیتے کہ ان اقداروں کی جانب قوم کی نظر ہو حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُومِنِيْنَ رَؤُفٌ الرَّحِيْم کا دھیان ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم کسی کا دھیان کریں اور وہ نہ آئے۔ مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ غرض سے نہ پکاریں بلکہ یاد سے پکاریں، محبت سے پکاریں، محبت والے کی پکار کا انداز ایسا ہوتا ہے جیسے کہ بھوکے کا۔ محبت کی دہائی دیں، پھر دیکھیں اللہ کی رحمت اور غیرت کا انداز۔ یہ عمل عملیات اور ملائک کو اپنانا کیا۔ یہ خلیفتہ اللہ تو نہیں حقیقت کے میدان میں انسان ہی خلیفتہ اللہ ہے۔ ایک دفعہ موج میں آ کر کہہ تو دے کُن پھر دیکھے كُلَّ يَوْمٍ هُوفِي شَانٌ کا انداز، پھر دیکھے ماأعظم شانی کا انداز!

اسلام ترتیب، مرکزیت، جمعیّت، نمو، فروغ کی زندگی کی نشانی ہے۔ زندگی کے اس انداز کو دیکھیں۔ اس کی محرک قوّتِ کُن پر غور کریں جس طرف اس شدّت سے اسلام رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی فہم کیلئے ادنیٰ سی مثال سے چلیں جو زندگی کی محرک قوّت اور ترتیب و جمعیّت

کی قوت کی نشان دہی کر رہی ہے۔ اس کی ایک کرسٹل میں ملتی ہے کہ کیسی کیسی ترتیب دار اور خوش رنگ شکلیں یہ جیسے خود بخود اختیار کرتے ہیں۔ ان کے پیچھے اس قوّتِ کُن کا کیف لیں پھر جس کے خلئے کی زندگی پر غور کریں۔ اس میں ترتیب، مرکزیت، جمعیّت اور نمو پائے جاتے ہیں۔ زندگی کے اس راز کو جاننا ہے۔ یوں مادّہ اور توانائی کو تو انسان نے جان لیا ہے کہ یہ ایک نسبت ہے اور توانائی سے مادہ وجود میں آ سکتا ہے، مگر توانائی اور زندگی کا کیا تعلق ہے۔ کرسٹل کی ترتیب اور کیمیاوی بندشوں میں وہ قوّت کیا ہے جس ذریعہ نئی نئی شکلیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ اب دیکھیں کہ ذہن اور زندگی میں کیا تعلق ہے۔ ایسا ہی کچھ اسماء کا انداز ہے کہ ان کے نقشے، لطائف اور انوار کی بھی کوئی نہ کوئی شکل ہے۔ صفات کے یہ نئے نئے نقشے اور ان کے پیچھے محرّک قوّتِ کُن فہم میں ضرور آتی ہے کہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سوائے اس جمعیّت بندی کی محرک قوّت کے کچھ نہیں۔ اسی جمعیّت و ترتیب سے کیسی کیسی قوّتیں ظہور میں آ رہی ہیں۔ انفرادی اور قوموں کی زندگی میں اسی جمعیّت بندی کی وجہ سے نئی نئی قوّتیں ہیں اور وحدت کا رنگ ہے۔ اس حیاتِ جمعیّت کا منبع سوائے امرِ ربّی کے اور کیا ہے۔ جسم میں روح کا پھونکا جانا ہی کیا کم رحمت کا انداز تھا کہ مادّہ میں بھی زندگی حلول کر آئی اور امرِ ربّی بھی یہاں مادّی قوانین کی کیا رسائی ہو اور اس کی تہ تک کیا پہنچے۔ یہاں ظواہر عالم خواہش، تدبیر، عمل و ریاضت عقل و تخیل کا دخل نہیں۔ یہ حیاتِ باطن ہے۔ یہاں رحمت و محمودّیت ہے۔ اس رحمت کو مادّی دائرے تک کیا محدود رکھنا کہ مادّہ خود توانائی اور اس سے اوپر حیات و رُوح کا پابند ہے۔ اسلام اسی سطح پر رحمتِ عالم بن کر آیا کہ متلاشیانِ حق کو روح کے مقام پر ہی سنوارا۔ لہٰذا روح کی سطح پر اسلام میں داخل ہوا تو زندۂ جاوید ہوا۔ اسلام کے موجودہ پیرویان کو تو ضرور اسی مقام سے حیات کرنی ہے۔ یوں دینِ اسلام فطرتِ انسانی میں فطری طور پر موجود ہے۔ باطنِ انسانی اور وجود کی تمام صلاحیتیں اسلام پر ہیں، ہادیان دین کو ان ہی صلاحیتوں کو جگانا ہے۔ یا پھر زمانہ کی اونچ نیچ سے جیسے ہی باطنِ انسانی صحیح راہ پکڑتا جائے گا۔ اسلام کے انوار خود بخود عالمِ میں کھلتے جائیں گے۔ جس جس نے اس روشنی کو پا لیا اسی کو رُخ ملِ جائیگا۔ وہی اسلام کا علمبردار ہو جائے گا۔

اسلام میزان قائم کرنے کا سبق دیتا ہے۔ دوسرے مذاہب پر اسلام کو یہی فوقیت ہے کہ اسلام اپنے پیرویان کو تنگی وعسُرت اور غربت میں بھی توازن قائم رکھنے کا سبق دیتا ہے اور فتح ونصرت، فراخدستی اور آسائش میں بھی فتح ونصرت میں انکساری اور میزان قائم رکھنے کا سبق اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اوراس کی کامیابی اور تیزی سے پھیلنے کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔ عیسوی اسلام پر جو اسلام قولِ فیصل کو فضیلت ہے اس کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے۔ غربت ومسکینی میں نگاہ مالکِ کائنات کی طرف اٹھنا قدرتی امر ہے۔ کیوں کہ یہ انسان کا فطری جذبہ ہے۔ اپنی بقاء کیلئے مختلف سہاروں ماں، باپ، ساتھی، جماعت ملکی نظام وغیرہ کا انسان طلبگار ہوتا ہے اور جب اپنی بے کسی، کسمپرسی کو یہ بھی سہارے نصیب نہیں ہوتے تو نگاہ قدرتی طور پر اپنے رب کی طرف اٹھتی ہے۔ اسلیئے کہا گیا ہے کہ غربت ومسکینی، بیماری وابتلا، سستی آزمائشیں ہیں، ان حالتوں میں یہ آسان ہے کہ نظر مالکِ کائنات سے ہٹنے نہ پائے بچّہ تک تکلیف میں ماں باپ کو پکارتا ہے۔ پھر ان سے لپٹتا ہے، پھر ان سے اور بھی قریب ہو جاتا ہے۔ قُربِ الٰہی عطاء ہونے کا بیشتر ذریعہ یہ غربت ومسکینی ہی رہی ہے۔ مختلف انبیائے کرام اور اولیاء کی زندگیاں اس صبر آزمائی کا نمونہ رہی ہیں۔ تنگی وعسرت وغربت و بیماری میں ان کی نظریں اور شدّت سے اپنے محبوبِ حقیقی کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس طرح اپنی میزان قائم رکھ کر یہ سب صابرین، ناپ تول میں پورے اُترے۔ قربِ حق کا لابدُی پہلو یہی صبر آزمائی ہے۔ خون کے آنسو صبر و رضا سے جذب کرکے، شمع کے گرد پروانہ وار فدا ہوکر ہی یہ ہستیاں اپنی زندگی کی معراج حاصل کرتی رہی ہیں۔ پست، ہمت اور دنیا دار انسان کا ذکر ہی کیا۔ جب ان کی نظر ہی حق سے ہٹی ہوتی ہے اور وہ صرف دنیا ہی کے طلبگار ہوتے ہیں تو ان ہی آزمائشیوں یا دنیاوی تکالیف سے تنگ آکر یا خودکشی کر لیتے ہیں، یا اللہ سے بھروسہ کھو کر تاریکی میں زندگی گزارتے ہیں۔ جب خالق کو اس انداز میں بھی نہ مانا کہ وہی پیدا کرنے والا، وہی ربوبیت کرنے والا تو کیا حقِ بندگی ادا ہوا! جب رب پر سے بھروسہ اٹھ گیا تو الٹا خسران میں پڑے۔ قوانینِ فطرت، اتفاقاتِ زمانہ اور عقل کی محدود حدود اور وسیلوں میں پابند رہ کر زندگی گزارتے رہے۔ اور تسلی کیلئے اپنے کو آزاد گردانتے رہے جن کی نظر شمسِ حقیقت

پر نہیں ہوتی ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔ دوسری دنیا ان کیلئے یا تو ہوتی ہی نہیں یا اندھیر ہوتی ہے۔ اسلام اپنے پیرویان کو بہ طفیلِ رحمتِ اللعالمینؐ اس قسم کے تخیل تک سے بیزار رکھتا ہے۔ اور بیزاری کا بھی کیا سوال۔ جب دامنِ رحمت میں پناہ ملی تو ہر شکستہ سامانی کے تخیل سے ہی پاک ہوا۔ یار ہی پر نظر رہی یاد ہی کیلئے جیتے رہے، اور یار ہی پر فدا ہوئے یہ یک رُخی ایمان تو اس وقت نصیب ہو جاتی تھی جب **لاالٰہ اِلّااللّٰہ محمّد الرَسُول اللہ** کہہ کر رحمت اللعالمینؐ کا دامن پکڑا تھا۔ پھر جب پروانہ دار شمع حقیقت کے گرد طواف شروع ہوا تو کیسی تنگی، کیسی عسرت، اپنا سب کچھ ہی یار پر فدا کیا۔ یہی وجہ تو تھی کہ فدائیانِ اسلام کو جب عرب کی تپتی ہوئی دھوپ میں گرم ریت پر لٹا کر پتھر رکھ دیا جاتا کہ کروٹ بھی نہ لے سکیں تو بھی اَحدٌ اَحدٌ اسی محبوبِ حقیقی کا کلمہ پڑھتے تھے۔ ہر انداز کے ابتلاً اور آزمائش میں یہ جاں نثار پورے اترے۔ صبر و رضا کے پیکر بن کر زمانے میں پیش ہوئے۔ پھر بھی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یہ سستا سودا تھا۔ سستی آزمائش تھی۔ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی کسی نہ کسی انداز میں اس صبر و رضا کے نقشے دنیا کے آگے پیش کرتے رہے۔

اسلام کی جو فوقیت کردار اور میزانِ عمل کی بلندی قابلِ تحسین ہے وہ اس بات پر ہے کہ اس کے پیرویان نے فتح و نصرت یا فراخدستی اور عیش و عشرت کی زندگی میں اس میزان کو قائم رکھا۔ قربِ حق کی جانب لو لگائے رکھنے کا یہ وہ انداز ہے جو عقل اور مادہ پرستی کی سطح سے کہیں بلند ہے۔ ظاہر ہے کہ کامیابی، اور عیش و عشرت میں عام انسان خدا سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور مخلوق کے ساتھ اور سنگدل و مغرور بن جاتا ہے۔ اسی لئے اس توازنِ حیات سے کہیں دور جا گرتا ہے جو شرف و فضیلتِ انسانیت ہے۔ تاریخِ عالم ان واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب جنگوں میں کامیابی کے بعد دشمن زیر ہو چکا ہو یا دنیا قدموں میں آ رہی ہو تو اس حالت میں یہ فاتح اس کامیابی، قابلیت اور عروج کو اپنی ہی صلاحیتوں پر منسوب کرنے لگتا ہے۔ خدا کی مدد یا رحمت و برکت و احسان کا تخیل تک اسے نہیں آتا۔ اس کامیابی کے ساتھ ساتھ وہ مظلوموں اور مفتوحین پر اور ظالمانہ سلوک کرتا ہے۔ احترامِ آدمیت کی جانب اس کی نظر نہیں اٹھتی۔ اپنے غرورِ نفسی کے بتوں کو وہ اور بڑھا چڑھا کر بہ بانگِ دُھل اپنی ہی کبریائی

کے دعوے کرتا جاتا ہے۔

حضورؐ پُر نور کی شانِ رحمت اللعالمینیؐ اور آپ کی افضلیتؐ جملہ مخلوق پر اسی بات پر بھی ہے کہ آپ نے عاجزی، مسکینی، توکلؑ کے انداز کو تو اپنایا ہی، مگر صبر و استقامت کی میزانِ اسلام کو اس حالت میں بھی قائم کر کے دکھایا جب فتح و نصرت و کامرانی آپ کی جماعت کے قدم چوم رہی تھی۔ جب ظالم متنفی، اور شدید ترین دشمن کا وجود اور عدم وجود آپ کے تصرّف میں تھا۔ تاریخ عالم میں اور کونسی ہستی ایسی گزری ہے جو اس میزان پر پوری اُتری ہو۔ یہ کتنی صبر آزمائی ہے کہ جب ایسے اغیار زیر ہوں۔ جنہوں نے غم پر غم، تکالیف پر تکالیف پہنچائی ہوں، آپ کے عزیزوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں تو انہیں بھی مقامِ آدمیتؑ پر نوازا جاتا ہے۔ شرافت و رحمت کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ وہی لوگ تو تھے جنہوں نے برسوں چراغِ ہدایت کو گُل کرنیکی کوششیں کی تھیں۔ جو اللہ اور رسول کے دشمن تھے۔ جن کیلئے اجازت تھی کہ ایسے مفسدوں کو قتل کرو جہاں پاؤ۔ وَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ط اقتدار و کامیابی اور خوش حالی میں ایمان اور توازن قائم رکھنا بہت مشکل چیز ہوا کرتی ہے، دوسرے فاتحین کے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں۔ کامیابیوں کے بعد شہر کے شہر بے دریغ تیغ کر دئے جانے کی مثالیں ہر ایک کو معلوم ہیں۔ ادھر اسلام کا انداز دیکھیں کہ اپنی کمزوری کے زمانے میں بھی، جنگِ بدر کے بعد اسیرانِ جنگ فدیہ لے کر چھوڑ دئے جاتے ہیں یا دو چار چار کر کے صحابہ کے حوالے کئے جاتے ہیں کہ آرام کیساتھ اس وقت تک رکھے جائیں جب تک دس دس مسلمانوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دیں۔ صحابہ کرام ان قیدیوں کو مہمانوں کی طرح گھروں میں رکھتے ہیں۔ اپنا کھانا ان قیدی مہمانوں کو کھلاتے ہیں اور خود کھجور پر گزارہ کر لیتے ہیں۔ فتح مکہؑ کے بعد، حضورِ اکرمؐ کے پیچھے دس ہزار کا لشکر تھا مگر مغلوب دشمن سے اس وقت بدلہ لینا، رحمت اللعالمینی شان کے خلاف تھا۔ حرم میں پناہ لینے والوں، اپنے گھروں میں رہنے والوں اور ابوسفیان اس وقت کے دشمنوں کے سردار کے گھر میں پناہ لینے والوں سے کوئی تعارض نہ تھا۔ صبر و استقامت اور میزان کی اس مثال کو کئی بار اپنے اقتدار کے زمانے میں مسلمانوں نے دہرایا۔

بادہ نوشیدن وہشیار نشستن سہل است
گر بہ غربت بہ رسی پست نہ گردی مردی
گر بہ دولت بہ رسی مست نہ گردی مردی

اسلام نے ہر انسان کو ہر حال میں اپنی میزان قائم رکھنے کا سبق دیا ہے۔ عالم انبساط میں اللہ سے رابطہ نہ ٹوٹنا یا ظلم و تشدّد کو ناجائز قرار دے لینا کتنی پامردی کی بات ہے پامال شدہ دشمن پر نہ جذبۂ انتقام بھڑکنا، نہ اس کو ذلیل کرنا، نہ اس کو قید کرنا، نہ اس پر پہلا تیر چلانا، نہ اس کے بچوں اور عورتوں سے تعارض کرنا کتنی بے پناہ انسانیت اور رواداری کی مثال ہے، مغلوبین میں سے جنہوں نے تھوڑا سا جزیہ دے کر پناہ میں آنا چاہا ان کی جان و مال کی آبرو اسلام کے پیرویان کے ذمہ ٹھہری۔ انہیں زبردستی مسلمان بھی نہیں کیا گیا کیوں کہ **لاَاِکراہَ فی الدین**، حکم قرآنی تھا۔ شرافت اور اعلیٰ کردار کی مثال، مقتولین کی بیواؤں کے ساتھ پیش کی جاتی ہے کہ انہیں غلام بنا کر بیچا نہیں جاتا بلکہ ان کو ایسوں کے دامنِ عاطفیت میں پناہ دی جاتی ہے جو ان کی عزت وعصمت و آبرو کی حفاظت کریں۔ شریف النفس ہوں اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ کردار کے مالک ہوں اور معاشرہ میں ان عورتوں کو باعزت مقام عطا کر سکیں۔ اسلام کے اسی اعلیٰ اخلاق و کردار کے آگے بیشتر لوگ سرنگوں ہو جاتے تھے اور اسلام قبول کر لیتے تھے۔

جاننے کی بات ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی بارہ سالوں میں چھتیس ہزار شہر فتح ہوئے لیکن مسلمانوں نے اپنی شرافت کی مثالیں دکھا کر دنیا کو حیران کر دیا۔ نہ شہروں کو لوٹا، نہ عورتوں سے تعارض کیا، نہ بوڑھے اور بچوں پر ظلم کیا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف ایک سو بارہ سال میں اسلام، مشرق میں ملتان تک اور مغرب میں جنوبی فرانس تک پھیل گیا۔ محمد بن قاسمؒ کے ہاتھوں سندھ فتح ہوا۔ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا راستہ کھلا اور یہاں سات سو سال تک مسلمانوں نے حکومت کی۔ ادھر طارق ابن زیادؒ کے ہاتھوں، افریقہ، اسپین، پرتگال اور فرانس کا جنوبی علاقہ فتح ہوا، اور سات سو سال تک عربوں کی حکومت اسپین پر رہی۔ فاتحین کی حیثیت سے مسلمانوں نے مفتوحین پر ظلم نہیں ڈھایا، نہ ان کی آبادیوں یا مذاہب کا صفایا کیا

بلکہ رحمت بن کر چھائے۔ حضرت عمرؓ اور صلاح الدینؒ ایوبی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو کسی قسم کا کشت و خون نہیں ہوا۔ بابر اور علاؤالدین خلجی دہلی پر قابض ہوئے تو نہ دہلی لوٹی گئی، نہ ظلم و ستم کیا گیا۔ حالیہ جنگ ہندو پاک ۱۹۶۵ء میں کھیم کرن، اچانک جوابی حملے میں فتح ہوا تو نہ جوان ستائے گئے، نہ بوڑھے، نہ بچّے نہ عورتیں۔ سب ہی کو جان بچا کر نکل جانے کی اجازت دی گئی گولہ باری سے مرے ہوئے لوگوں کی لاشوں کو احترام سے ڈھانکا گیا۔ تاریخ کے اوراق نہ سہی مگر وہ ہزاروں لوگ جن کو با حفاظت نکل جانے دیا گیا، اس بات کے شاہد ہیں یہ سب کچھ اسی لئے تھا کہ اسلام کو ایک پیام دنیا کو دینا ہے۔ رحمت بن کر دنیا پر چھانا ہے۔ جہاں میں مسلمانوں کے پھیلنے کا ایک ہی مقصد تھا کہ مخلوق کو خالق کی طرف رجوع کریں انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر، فطری آزادیوں کے سائے میں حق کی راہ پر گامزن کر دیں۔ اسلام، انسانیت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کیلئے نہیں آیا تھا بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے۔ اسلامی حاکموں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو حاکم ہوتے ہوئے بھی اپنی روزی آپ کماتے، نانِ جویں پر ہی گزارہ کرتے۔ بادشاہت ہوتے بھی سادگی کی زندگی گزارتے۔ بہت سے اسی پر فخر کرتے کہ خود بھوکے رہتے اور اپنا کھانا، اپنی دولت دوسرے مستحقین پر خرچ کرتے۔ یہ اس لئے تھا کہ ان کے سامنے حضور نبی کریمؐ صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کی مثالیں سامنے تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ امیر آدمی آسمانی بادشاہت میں داخل ہو۔ ادھر اسلام نے یہ کر کے دکھایا کہ امیری میں بھی فقیری کو نہ چھوڑا۔ دولت نے بھی ان کے ایمانوں کو خراب نہ ہونے دیا۔ عاجزی و مسکینی کو اس کامرانی اور فراخ دستی کے دور میں نہ چھوڑا، اس اعلیٰ کردار کے پیچھے ایک نکتہ ہے۔ اللہ اکبر! اس کی واردات قوم پر فتح کے عالم میں تھی۔ کبریائی اور سربلندی اسی ذات کی تھی۔ فتوحات اسی کے کرم سے تھیں اسی لئے غرور کی جگہ اس فاتح قوم کے سر، ہر کامیابی میں اس کی بارگاہ میں جھک جاتے تھے۔ انگریزی کی مثال ہے طاقت بگاڑتی ہے اور مکمل طاقت مکمل طور پر پر بگاڑتی ہے۔ مگر یہاں حال اس کے الٹ تھا۔ مکمل طاقت و قدرت کے وقت، قوم پر مزید اللہ کی کبریائی طاری ہوتی تھی۔ عجز و انکسار

کے عالم میں وہ اور اپنے خدا سے نزدیک ہو جاتی تھی۔

سرکارِ دو عالمؐ کے علاوہ تاریخِ انسانی میں کوئی ایسی ہستی نہیں جس نے انتہائی مفلسی بھی دیکھی اور انتہائی عروج بھی اور دونوں حالتوں میں پاؤں ڈگمگانے نہ پائے۔ نہ اس توازن میں خلل آیا جو افضلیّت آدمیّت کی دلیل ہے۔ حضورِ اکرمؐ نے احترامِ آدمیّت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کو قید و پابندِ سلاسل رکھنا، معیارِ آدمیت سے گری ہوئی چیز ہے، اسی لئے آپ کے زمانے میں نہ زندان خانے تھے نہ کنزویشن کیمپ نہ برین واش کرنے کے طریقے۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ مخالفین کو قید میں رکھ کر اُنہیں کب دوست بنایا جا سکتا ہے! نہ ان کے خیالات کو بدلا جا سکتا ہے، نہ ان کی باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عملی طور پر یہ دکھا دیا کہ کسی انسان کی آزادی کو سلب کر لینا ہمیشہ غلط ہوتا ہے۔ اسی لئے سب سے بہتر فدیہ غلام کو آزاد کر دینا ٹھہرایا۔ غلاموں کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک آقا اور غلام والی بات نہ تھی بلکہ میزبان اور مہمان والی۔ یہ دستورِ محمدیؐ، یہ میزانِ اسلام آتی دنیا تک ایک دائم قائم نمونۂ حیات و اخلاق ہے۔ رحمت اللعالمینؐ شان کا اظہار ہے۔ ظاہر باطن کی میزان ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ لین دین میں ناپ تول پورا پورا کیا کرو! یہ ترازو کے دو پلڑوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ انسان اور انسانیّت کے ستر ہزار پلڑے ہیں۔ ان کو میزان میں لانا ہے۔ اس میزان کی ایک مثال تو کائنات کے کروڑ ہا اجسام کا توازن ہے کہ اپنی اپنی کشش کے باوجود، اس کلی میزان میں قائم ہیں جو پوری کائنات میں ہے۔ نئے اجسام فلکی ظہور میں آ رہے ہیں اور بہت سے اپنی مدت ختم کر کے اسی کائنات میں روپوش ہو گئے۔ پھر بھی اس توازن میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہی توازن قوموں کی زندگی میں برقرار ہے اور انفرادی زندگی میں یہ توازن اپنے نفس، قلب، روح کی میزان ہے۔ اعتمادِ خودی ہے۔ باطنی توازن کی شان کے تو کیا کہنے! مادّی زندگی میں ہی اس توازن کی طرف توجہ کریں تو عقل و دانش کو شعور ملے۔ یہ سانس کا چکّر، یہ دورانِ خون، یہ نظام اِنہضام، یہ اعصابی و استخوانی نظام، سب کے سب

ایک توازن میں ہیں۔ یہ توازن ایک فرد کی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ نسلاً بعد نسلاً نئی شان، نئی آن میں اس کی رعنائی ہے۔ اپنی عقل و دانش، اپنے ارادے اور اعمال، اپنی خواہشات اور قلب کی پکار، اپنی روح کی فریاد، نت نئے رنگوں میں ہمیں توازن میں رکھے ہوئے ہیں، چونکہ ہمیں قوّتِ ارادی اور عقل و تمیز و ولعیت ہوئی ہے۔ اس لئے اپنی میزان خود قائم رکھنے کی ہمیں تلقین ہے۔ مثلاً غصہ زہر ہے اور رحم کمزوری کا باعث ہوسکتا ہے۔ ان دونوں کی میزان کی جائے تو شجاعت بن جاتی ہے اور اگر یہی چیز رضائے الٰہی کے تحت ہو تو ملکوتی صفات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح نفس بذاتِ خود گڑھے میں گراتا ہے اور قلب بخود گمراہی کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کی میزان، انسان میں فکر و استعداد پیدا کرتی ہے۔ یہ سوچنا کہ نفس کو مار ڈالا اور قلب میں رسائی ہوئی ایک ناممکن بات بھی ہے اور توازنِ حیات کے خلاف بھی۔ اسی طرح نفس اور عشق سے بے بہرہ ہو کر روح تک پہنچنے کی امید ایک تخیّلی غلط فہمی ہے۔ اسی لئے نفس، قلب، روح تینوں کو میزان میں لا کر انسان اپنا مقام پا سکتا ہے اور اسی کیفیت میں حیات بعد الممات کی حقیقت جان سکتا ہے۔ ہم یہ جو کہتے ہیں کہ حقیقت ستّر ہزار پردوں میں ہے، یہ دراصل اپنے آپ ہی میں رسائی کرنی ہے۔ ستر ہزار پردوں سے یہ مطلب نہیں کہ ایک ایک کر کے پردے چاک کرتے گئے اور بڑھتے گئے۔ قطعی نہیں۔ نہ کہیں آنا ہے نہ جانا ہے۔ ان ستّر ہزار پردوں سے مراد یہ ہے کہ پس پردہ کے ہر روپ اور رنگ کو اپنا کر میزان میں رکھ کر، الا اللہ کے رموز میں بسنا ہے۔ ایسی ذات عالمِ وجود میں صرف ایک ہی گزری ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

جاننا ہے کہ ہر انسان، نفس، قلب، روح کی میزان ہی سے سکون پا سکتا ہے اور توازن کے یہی تین پائے ہیں۔ یہ بات وہی جان سکتے ہیں جن میں توازن آ گیا ہو۔ یہ نفس و قلب و روح کا توازن ہی توکّل ہے۔ اس توازن میں وہ کیفیّت ہے جو ایک ساکن سمندر میں ہے۔ یہاں دماغ، خواہش، ارادہ، یا نفس، قلب، روح پر اپنے قابو کی بات نہیں ہوتی بلکہ جیسے کہ مردہ غسّال کے ہاتھ میں ہے۔ اور غسّال بھی کون۔ جو کہ غوث ہو۔ اِس رحمت للعالمینؐ شان سے فیضیاب وہی ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو ایسا ڈھیلا ڈالدیں جیسا کہ مردہ غسّال کے ہاتھ میں۔

یہ مردہ کیفیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں سکون ہے۔ فروغ ہے۔ شدّتِ تحریک ہے۔ یہ وہ سکون وتوازن والی بات ہے کہ گالی بھی پڑ رہی ہو تب بھی یار کو دیکھ رہا ہو۔ انعام و اکرام ہو رہے ہوں تب بھی یار کی کارفرمائی اپنے میں نظر آ رہی ہو۔ یہ ہے رضی اللہ عنہ، کا مقام، یہ وہ انداز ہے کہ جیسے محبوب، طالب کو جبار کی طرح اپنی طرف گھسیٹ رہا ہو اور مدارج قرب عطا کر رہا ہو۔ یہ مقامِ جبروت ہے۔ یہ ہی ابتدائی قدم ہے قربِ حقیقت کا محبوب کو جو طالب کیلئے بے چینی تھی اُس کا عملی اظہار اس صورت میں کیا جا رہا ہے کہ طالب پر، فضل، برکت، رحمت کے دروازے کھول دئے گئے۔ جب طالب کا روحِ اعظم سے رابطہ ہوا اور اس نے جباریت کو اپنایا تو مسلمان بنا۔

قہاریؑ و غفاریؑ و قدوسیؑ و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اب گویا حقیقتِ محمدیؐ کی جھلک ملی۔ یہیں سے اللہ اکبر کے انوار، یہیں سے حیّ وقوم کے انداز اور دوسری خداوندی شانوں کی اپنے اندر سے تجلی ہوتی ہے۔ عاشق کو جب قرب عطا ہوا تو اس میں اندازِ انا لیلیٰ آ گیا۔ محبوبیت عطا ہوئی، خزانوں کی چابی ملی۔ محبت کی اس یکتائیتِ توحید کے صدقے وہ رنگ آیا کہ اس کی زبان حق کی زبان۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ فقیر کی زبان جبروت میں بولتی ہے اور وہ جو کہتا ہے، ہو کے رہتا ہے۔ یہ ہے کُن اس مقام کا۔ یہاں پر صحیح معنوں میں پتہ چلتا ہے کہ جبار کسے کہتے ہیں۔ لہٰذا دعا ہو تو اس سطح سے ہو۔ اس سے کم سطح پر دعا بے معنی چیز ہے۔ نفس کی سطح پر دعا کی کیا حقیقت۔ اور اس سے اوپر تو قلب کی دنیا، بے نیاز ہے۔ یہاں مانگنا اور لینا کیا۔ یہاں دینا ہی دینا ہے۔ پھر اس سے اوپر روح کا مقام ہے یہ مقامِ امر ہے یہیں سے عطا ہے۔ یہیں رحمت کا وسیلہ ہے اور عالمِ جبروت میں قدم رکھنا ہے۔ یہیں سے نورِ محمدیؐ سے رابطہ قائم ہوتا ہے اور آگے کی تمام منزلیں، مقامات، کیفیات، اسی رحمت اللعالمینؐ سائے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ یہ رحمت اللعالمینؐ یہ نورِ محمدیؐ، ایسی یونیورسل چیز ہے جیسے روحِ اعظم اور اس سے کہیں زیادہ لطیف تر ہے۔ یہ گویا ایسی یک

رخی ہے کہ تمام صفات سے نوازا ہوا، تمام صفات کا منبع اور اسی کے سہارے صفات کا ذات سے رابطہ، ذرّہ ذرّہ میں یہ نورِ محمدیؐ نمود کی منتظر ہے۔ اس صفتِ رحمت کا حبُ اور کشش کے انداز میں ہر ظاہر میں ظہور ہے۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ جہاں ہم مجرّ داتِ فطرت ہی کے اپنانے کے اہل نہیں تو اس نورِ محمدیؐ کے رابطے کے کیسے اہل ہو سکتے ہیں۔ جب تک اس نور کے نفاذ کے مرکز سے کم از کم محبت کا وسیلہ نہ ہو، اعلیٰ مدارجِ قرُ ب کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔ کیسے محبتِ الٰہی کے دعوے، کیسا عرفانِ حقیقت، یہ مدارج تو محبوبیت کی منازل ہیں۔ اِن سے اُن ہی کو نوازا جاتا ہے۔ جو اپنی لَا اِللہ کر کے، زینہ بزینہ، نفس کے پھندوں سے آزاد ہو کر، عشق کی بھٹّی میں نکھر کر، روح کی منازل میں اٹھا لئے گئے ہوں۔ پھر نسبتِ محمدیؐ کے طفیل مدارجِ اعلیٰ میں قدم رکھ چکے ہوں۔ قوم نے اب اسی وسیلے کو پکڑنا ہے وگرنہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس ظاہری شریعت میں گرفتار رہ کر، باطنی شرعِ محمدیؐ کو نہ پا سکے گی جو جانِ اسلام ہے اور جس کی نشاندہی حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے کر دی تھی۔ اسلام کی روشنی کو اب زمانے میں اسی انداز میں پھیلنا ہے کہ تجسّس براہیمی، شرعِ موسوی، عشقِ عیسوی کو میزان میں لئے، حقیقتِ محمدیؐ کے مدارجِ کنُ کی طرف پیرویانِ اسلام رجوع ہوں۔ یہی افضلیت ہے دینِ اسلام کی پچھلی منازلِ اسلام پر اور یہی بڑائی ہے اس کی خلعتِ براہیمی، شریعت موسوی، اور طریقتِ عیسوی پر۔ یہ میزان اسلام عَبْدَہٗ وَرَسُوْلُہٗ کا انداز ہے۔ رحمت کا نشر ہے۔ مسلمانوں کا خدُ ا الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ہے۔ عالم انسانی کو ایسے ہی الرحمن الرحیم کی تلاش ہے۔ روحِ اسلام جانِ اسلام محبت ہے رحمتِ ہے۔ شرع وطریقت کو اپناتے ہوئے اب اسی حقیقتِ محمدیؐ تک رسائی کرنی ہے۔ اور اسی کو عالم میں نشر کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی یعنی انسانیّت کی بنیادِ وجود ایک ہی ہے۔ انسان کو اپنی ظاہری اور باطنی زندگی ان ہی فطری صلاحیتوں کے تحت گزارنی ہے۔ گویا اپنے باطن کا عرفان حاصل کرتے ہوئے حق کی قدرت کے ان ہی خزینوں تک رسائی کرنی ہے تا کہ حقّ بندگی ادا ہو۔ تلاشِ حقیقت کی راہ پر گامزن ہو کر انسان اپنی فطرت سے ہم آہنگی کے حصول کے بعد، باطنی اندازِ توحید حاصل کرتا ہے۔ اور اس اندازِ توحید کے تحت ہی

اپنے ہر تخیل، ہر ارادے، ہر عمل کو کلی جمعیّت کے انداز میں تشکیل دیتا ہے، اس طرح انسان کی تمام صلاحیتیں یک رخی کے ساتھ بروئے کار آتی ہیں۔ مادّی حد تک تو انسان نے اس کی کافی سمجھ بوجھ حاصل کر رکھی ہے اور اسی یک رخی سے نسل انسانی نے اپنی تہذیب کے ارتقاء میں خاطر خواہ فائدے اٹھائے ہیں۔ لیکن قلب و روح کی سطح پر ان صلاحیتوں کی تلاش، اور ان کے ذریعہ عمل پیرائی کی طرف انسانیت کی کم ہی نظر اٹھی ہے۔ منشائے حق کے تحت مختلف دوروں میں انسان کو اپنے جیسے انسانوں کے ذریعہ ہی عقلی، قلبی اور روحانی سطحوں پر ہدائتیں ملتی رہی ہیں اور اس طرح مختلف دوروں میں ایک طبقۂ انسانیت اپنی تمام ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اسی کے سہارے باطن کے چراغ ہمیشہ روشن رہے ہیں۔ اس راہ کا ابتدائی قدم یہی تھا کہ تلاشِ حق اور تجسّس حقیقت کا انداز عین فطرتِ انسانی کے مطابق، فطری توحید میں نصیب ہو۔ وہ کسی نامعلوم شے کیلئے فطری تجسّس، وہ جاننے پہچاننے کیلئے فطری تڑپ، وہ حق اور باطل میں تمیز کرنیکی فطری صلاحیت، وہ اعلیٰ کردار، اخلاق حُسنہ کا فطری ادراک، وہ مجرّدات کی فہم، وہ خالقِ کائنات کے وجود کی بابت دل کی گواہی عین فطرتِ انسانی کی بات ہی تو تھی۔ اپنے رب کی بابت اپنے ہی باطن میں غرق ہو کر جو وجدانی انکشاف بیشتر صالحین کو حاصل ہوا صرف زبانی اقرارِ وحدانیت کی بات نہ تھی بلکہ ایقان کی سطح کی روشنی تھی۔ ایمان کی پختگی کی نشانی تھی اور عشق وجدان کے عالم کی چیز تھی۔ یہی کچھ اپنے باطن کے جاگنے کی پہلی سند تھی اس تیقنِ باطنی کے بعد ہی پھر کہیں شریعت کے اصولِ زندگی اصول بندگی، صحیح معنوں میں اپنائے جا سکتے تھے۔ جمیع خلائق سے ہم آہنگی کا انداز حاصل ہو سکتا تھا۔ مگر بیشتر زمانوں میں یہ ہوتا رہا کہ ہدایت آنے کے بعد بار بار عوام الناس، نہ صرف یہ کہ غفلتِ قلب و روح میں گرفتار ہوتے رہے بلکہ ان کی عقل ظاہر تک اسی غفلت کا شکار ہوتی رہی۔ نتیجتاً صرف ظاہری رسم و راہ کے طور پر عبادات کا پورا کر لینا، ارکانِ دین کی پابندی شمار کیا جاتا رہا۔ جب شریعت کا انداز ہی اس ظاہری سطح تک رہ گیا تو وہ بنیادی سطح کیسے استوار ہوتی جسے تجسّس حقیقت یعنی قلب و روح کی اپنے اصل کی تلاش اور تڑپ کہا جائے! اس ظلمت اور تاریکی میں پھر راہِ طریقت کہاں سے پاتے جس کی بنا محبت ہے، جس کا منبع قلب ہے،

جس کا اصول فدا ہونا ہے، دینا ہی دینا ہے اور جس کا پیمان، اپنے اصل سے تعلق یعنی میثاقِ ازل کی سطح کا ہے۔ دراصل یہ اپنے اصل کیلئے تڑپ ہی تو حق کی تلاش اور حق سے رابطے کا انداز تھا۔ یہ دل کی دنیا، وجدانی عالم کی بات تھی۔ اس کے تحت تو زندگی اور بندگی میں اور ان کی ہر ادا میں ایک والہانہ پن آ جاتا ہے۔ نیا جذبہ اور شوق ہر عمل کو نصیب ہوتا ہے۔ تو ہی تو کا رنگ سما جاتا ہے۔ عقل کی پرواز یہاں کیسے ہو۔ جب تک عقل کو عشق کے ذریعہ شعور حاصل نہ ہو۔ یعنی جب تک نفس و قلب کی توحید حاصل نہ ہو، یہ نئی راہ تلاش و عرفانِ حقیقت کی نہیں کھلتی۔ پھر فیضِ نظر سے رحمت اللعالمینی انوار کی تجلی نصیبوں کی بات ہے۔ دل کی سطح سے یہ ایک سادہ سی بات ہے کہ محبوب کی جانب شدّت کی یک رخی ہو اور سب کچھ محبوب کے نام پر فدا ہو۔ مگر عقل کیلئے یہ راہ نا قابلِ فہم بھی ہے اور دشوار بھی۔ جب محبت کے سہارے کسی کا کلمہ پڑ لیا تو اس کے ہو رہے۔ **لاٰالٰہ الاّٰللہ محمُد رسوُل اللہ** کہہ کر جب رحمت للعالمینی دامن پکڑا تو حقیقت کے میدان میں آ گئے۔ نواز لئے گئے۔ مقامِ روح میں اٹھا لئے گئے۔ اب جو رحمتوں کا سایہ نصیب ہوا تو صحیح معنوں میں اسلام میں داخل ہوئے۔ عقل کی سطح سے ان رحمتوں کو کیسے پایا جائے۔ فہم و ادراک یہاں معذور ہیں۔ عقل تو رحمت کے وسیلوں کے آگے بھی وسوسوں و فطانت و علم کے چکروں میں ڈالتی ہے یا پھر اپنی انانیت میں اپنی قوّتِ بازو، اپنی جدوّ جہد، اپنے علم و فضیلت، اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں پر ایسا بھروسہ اور یقین پختہ کراتی جاتی ہے کہ دوسری جانب نظر ہی نہیں اٹھتی۔ ظاہر ہے کہ عقل کی تقلید اور اس کی ہدایت سوائے گمراہی کے کیا ہو سکتی ہے۔ جب نظر ہی شمسِ حقیقت سے ہٹ گئی تو رہ کیا گیا۔ مگر جن کے قلوب روشن ہو کر نفس و قلب و روح کی میزان میں محبوب کی جانب یک رخی حاصل کر لیں تو انہیں اندازِ توحید حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کی تمام صلاحیتیں، یک رخی اندازِ وصال میں حق کی جانب بروئے کار ہوتی ہیں۔ انہیں ہی سلامتی و امن کے دامن میں پناہ ملتی ہے۔ انہیں ہی علم و فہم و عرفان نصیب ہوتا ہے اسی میزانِ توحید میں ان کے اپنے انداز نکھر آتے ہیں۔ اب وہ ہر ارادے، ہر شے، ہر عمل کے پیچھے اپنے رب کی کارسازی اور کارفرمائی دیکھتے ہیں۔ یہی یک رخی ان کے فروغِ عمل کی بنیاد بن جاتی ہے۔ اور اس طرح انہیں توکّل کا مقام نصیب ہوتا

ہے۔ گویا اب کہیں حقیقتِ محمدیؐ کی جھلک ملی۔ حقیقت کا اپنے اندر طلوع ہوا اور پکار اٹھے۔ 'میں نے اپنے رب کو پا لیا' اب حیّ وقیّوم کے انوار اپنے ظاہر باطن میں پھیلے۔ مقامِ جبروت، مقام قربِ عطا ہوا۔ عروجِ خود آگہی نصیب ہوا۔ مگر یہ وہ نازک پلِ صراط ہے کہ یہاں اناالحق کا دعویٰ کیا تو گردن گئی اور عبداللہ بنے تو محبوب کے لقب سے نوازے گئے۔ یہ عبداللہ کا مقام، عاجزی و مسکینی کی وہ انتہا ہے۔ کہ جیسے مردہ غُسّال کے ہاتھ میں۔ یہاں اناالحق کی انا بھی ختم۔ حق ہی حق۔ یہ مقامِ رحمت للعالمینؐ ہے۔ جہاں سے رحمت و محبت کا نشر کرنا ہے، کائناتِ عالم میں اور وجود ہی اس نشر کا ذریعہ یوں ہے کہ کائنات جو خود وجود میں ہے۔

جاننا ہے کہ مادّی اشیاء اپنی اپنی فطرت کے مطابق۔ اپنی اپنی حد تک حق کی قوّتوں کو اپنائے ہیں اور ان کے انشراح کا ذریعہ بنی ہیں۔ انسان کی ہستی تمام صفاتِ نفس، قلب، روح سے نوازی گئی ہے۔ اب یہ اس کی اپنی تدبیر ہے کہ جس حد تک بھی چاہے، حق کی قدرتوں کی شناسائی، اور رابطہ حاصل کر کے ان کے نشر کا ذریعہ بنے۔ اگر عقل کی سطح تک بھی کسی قسم کی کوشش نہ کی تو جانوروں سے بھی بدتر اور اگر آدمؑ کی اولاد میں شمار ہونا ہے تو نفس کے ساتھ ساتھ قلب و روح کی منازل میں جب تک قدم نہ رکھے، عروج کی راہیں کیسے کشادہ ہوں۔ اگر پست ہمتی یا تن آسانی میں صرف مقامِ نفس تک ہی حق کی قدرتوں سے روشناس ہونا چاہا، تو گویا صرف تجسّس عقل کی حد تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ یہ ضرور ہوا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج کی فہم حاصل ہو گئی مگر تسخیرِ کائنات نہ ہو سکی۔ تسخیر قلب نہ ہو سکی۔ روح کے مقام پر، امر کی کارفرمائی نہ کر سکے۔ اور راہِ حق میں تجسّس حقیقت کا وہ براہیمی انداز بھی ہاتھ سے کھویا جو بنیادِ دینِ فطرت ہے۔ جو انسان کا فطری جذبہ ہے۔ یہ تڑپ حاصل ہوتی تو مَافِیْ قَلْبِیْ غَیْرَ اللّٰہ، کا انداز آ جاتا۔ توحیدِ وجود حاصل ہو جاتی۔

اس سے ایک قدم آگے جب نفس و عقل کو تہذیب دے کر مقامِ لطیفۂ نفس سے شریعت کی رسم و راہ کی پابندی ایک ہدایت کی روشنی میں ہوتی تو ظاہر داری سے بچتے۔ یوں صرف عقلِ ظاہر کی پابندی کر کے اور موسوی شرع کی طرح ارکان دین کی سختی سے پابندی

کر کے کہاں تک پہنچتے! جب تک وہ اندازِ کلیمی، وہ جلالِ موسوی، وہ علم لدُنی کو نہ پا لیتے حَسْبِیْ رَبِّیْ جَلَّ اللّٰہ، کا انداز کہاں ابھرتا۔ اس کے بعد طریقت کی راہ و رسم میں پروان چڑھنا جن جن کے نصیب میں تھا۔ وہ محبت کا سبق عیسوی انداز میں دہراتے رہے۔ ان ہی کے ذریعہ عالمِ انسانی میں محبت و عشقِ حقیقت ذات کے انداز نشر ہوتے رہے اور جب ان پُر نُور محمدؐ کے انوار کی بارش ہوتی رہی تو چاند کی طرح انوارِ حقیقت کی عکاسی اس کائنات میں کرتے رہے۔

پھر جب ایسے عشاق اپنے نصیبوں کے تحت رحمت للعالمینؐ دامن میں رحمتوں میں بسائے گئے۔ تو خود سورج بن کر عالم امکان کو ہدایتِ حق کی روشنی بخشتے رہے۔ یہی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے مصداق ہو کر کلمۂ لَا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ مُحَمَّدَ رُسُول اللّٰہِ کی خود تصویر بن کر پیش ہوئے۔ حق ایسے ہی مومنین اور ایمان والوں کو اسی سطح سے پورے پورے طور پر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔

دیکھا جائے تو انبیائے کرام کی منازلِ ارتقاء عالم انسانیت کی منازلِ ارتقائے باطن ہیں۔ جسم انسانی کی طرح باطنِ انسانی کی بھی تکمیل ہو چکی ہے۔ عالمِ انسانیت کا باطن بچپن کی زندگی گزار کر اب جوانی کی خودمختاری میں تیرہ سو سال سے قدم رکھ چکا ہے۔ اب اپنے ہی غیب کے خزانوں میں فتح الغیب کر کے حقیقتِ محمدیؐ تک رسائی کرنی ہے۔ اور اسی کو اپنا کر عالم میں نشر کرنا ہے۔ اور کچھ اس انداز میں کہ جو اس کی مرضی وہ حق کی مرضی، جو کہا ہو گیا۔ کُن فَیکُون

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
لیکن کشید آں زِکمان محمدؐ است

☆☆☆☆

باب ۸

میں کیا کروں

ہر انسان کا فطری سوال ہے ''آخر میں کیا کروں'' اِس کا جواب خود اس کی اپنی فطرت، اپنے باطن سے آنا ہے۔ بیرونی سطح سے کسی قسم کا تعیّن نہ کوئی رخ عطا کرسکتا ہے، نہ رہنمائی، نہ جذبۂ عمل کو قیام۔ حیات و قیام اپنی ہی ذات میں ہے اور ان ہی کی بے ساختگی میں اسے عمل پیرا ہونا ہے۔ میں کون ہوں، کیا ہوں کی بھی انسان کو اتنی فکر نہیں جتنی کہ میں کیا کروں کی کیا کروں کے ذریعہ ہی وہ کیا ہوں کا نشان پا سکتا ہے اور اپنے کردار ہی سے اپنا جائزہ لے سکتا ہے۔ یہ کروں کی شدّت وہی کمّیت ہے جو ذرّہ ذرّہ میں نمود کی بے تابی ہے۔ اس شدّت میں کروں کو نہ حد ہے نہ تعیّن۔ ہے تو بس اتنا ہی کہ 'ہے' ہو رہا ہے، یا اس ہو رہا ہے سے بھی بے خبری۔ البتہ اس ہوش و حواس کی دنیا میں جسے ہم عالمِ مادّی کہتے ہیں۔ یہ لازم ہے کہ تعیّنات کے آئینہ میں ہی رونمائی کرکے یہ فیصلہ کریں۔ کہ میں کیا کروں۔ اس فیصلہ کو نہ اپنی فطرت سے کوئی غیریت ہو، نہ زندگی سے، نہ منازل ارتقاء سے، نہ کائناتِ عالم سے، کائنات میں یکتائیت ہے، توازن ہے، میزانِ توحید ہے، خالق و مخلوق میں کوئی دوئی نہیں، اسماء و صفات و مجرّدات میں اپنی اپنی یکتائیت۔ مگر دوئی نہیں۔ زوجین، ضدّین، ظواہرِ عالم میں اپنی اپنی انفرادیت ہے مگر دوئی نہیں۔ خود اپنے جسم کے مختلف اعضاء میں انفرادیت کے ساتھ یکتائیتِ توحید ہے۔ یہی حال اپنی ساری ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کا ہے کہ زوجین ہیں ضدّین ہیں مگر غیریت نہیں۔ بات بس یک رخی کی ہے کہ ہر شے کا مثبت پہلو دیکھیں اور پائیں۔ انعام و اکرام خداوندی پر نظر ہو نہ کہ اپنی نامرادیوں پر۔ اس طرح بندے اور مولیٰ کا لگاؤ قائم رہے تو شکرانۂ زندگی ادا ہوتا رہے وگرنہ غیریت ہو تو ہزار محرومیاں، ہزار پشمانیاں، عام انسان کی زندگی ہو یا خواص کی، حیوانی سطح کی زندگی ہو یا تہذیب یافتہ نفس کی، بات ہر سطح

کی ان ہی انعام و اکرام کی طرف نظر رکھنے سے بنتی ہے۔ یہ یک رخی فطری طور پر ہر ایک بچّہ میں ہوتی ہے۔ اسے شفقت پر بھروسہ میں ایک راہِ عمل ملتی ہے۔ اور پروان چڑھتا ہے بڑے ہونے پر جب بھی وہ ربوبیت سے رابطہ منقطع کر لیتا ہے تو محرومی و تاریکی و جمود میں گھر جاتا ہے۔ شمسِ حقیقت کی موجودگی میں اپنی تاریکیوں اور ظلمتوں سے نکل کر اپنے رحمت کے احسان کو پانا ہوتا ہے ورنہ تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ رحمٰن کے سایوں میں ہر ذی ہوش کو خوداعتمادی نصیب ہوتی ہے اور مراد کو پہنچتا ہے۔ رحمٰن سے نظر ہٹا کر اپنی ''میں'' کے فریب میں پھنس جائے تو انجامِ کار نامرادی، رحمانیت کی تجلّی اور شیطنت کی ظلمت ہر انسان کے اپنے اندر ہے۔ رحمٰن کے انعام و اکرام کا شکرگزار ہوتے ہوئے وہ تکالیف میں بھی مطمئن زندگی گزارتا ہے وگرنہ اپنے شیاطین کے زیر اثر وہ نامرادیوں اور شکوہ شکایت میں دن گزارتا ہے۔ ایک سطحی نظر سے انسانی زندگی کو دیکھا جائے تو جسمانی مادّی تقاضوں کے حصول میں، اپنی حرص و ہوس کی حد ہے نہ حساب، انجام اس کا بھی محرومی، لاکھ انسان اپنی جسمانی ذہنی، نفسیاتی صلاحیتوں کو خودتربیت دے کر پوری شدّت و انہماک اور یک رخی سے کام کرے تب بھی اسے نہ تو تسلی نصیب ہوتی ہے، نہ تسکین، کیسی ناکامیاں بلکہ کامیابیوں پر کامیابیاں ہوں تب بھی انسان کے اندر وہ سوال اپنی جگہ رہتا ہے، کہ اور کیا کروں؟ یہ فتح النفس کیسے حاصل ہو۔ نفس کو دبانا، مارنا یا فنا کرنا تو گویا فطری صلاحیتوں سے بیزاری، روگردانی اور انحراف ہے۔ اپنی بات ہو تو، خیر یہ تو خالق کے مقصدِ تخلیق تک سے گویا برسرِ پیکار ہونا ہے۔ اپنے وجود تک سے مغائرت اور منافرت کا پہلو ہے۔ ہر فرد کیلئے بہرحال اپنا وجود ایک حقیقت ہے۔ مگر دیکھنے میں یہی آیا کہ نفس اور مادّی سطح تک ہی اپنی زندگیوں کو محدود کر کے بہت سوں نے لاکھ ہاتھ پیر مارے، بڑے بڑے کارنامے کئے مگر آج نہ ان کا پتہ ہے نہ ان کے کام کا پتہ۔ سوائے اس کے کہ ان کے فسانے زیبِ داستان ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہی حال ان ریاضتوں اور مجاہدوں کا ہوا۔ جو رحمتوں کی تجلّی نہ پا سکے۔ تو اس ورطۂ میں گرفتار انسان کا یہ حال کہ جیتے جی بھی عذاب میں، اور مرنے کے بعد بھی عذاب میں۔ یہی حرص و ہوا، حسد، بغض اور نامرادیوں کے سانپ اور بچھو ان کی روح اور لاشعور کے لاشعور تک کیلئے سوہانِ جان بن گئے۔ بار بار اور لاکھ بار

انہوں نے تسکین و تسلی کی تلاش میں ان ہی کی کیفیات میں سے پھر سے گزر کر دیکھا مگر اپنی آگ میں جلتے رہے اس گرداب فنا میں وہی عمل باعثِ تسکینِ فطرت نظر آئے۔ جو دوسروں کیلئے فی سبیل اللہ کئے۔ یہی اعمال اپنے انجام کو پہنچے۔ اپنے نفس کی خاطر جو کچھ بھی کیا اس کی ناتمام تمنائیں عذابِ دائمی بن کر رہ گئیں۔ اس گرداب سے وہی نکلے۔ جنہیں رحمت کی تجلی ملی۔ انہوں نے رَبَّنا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا کا صحیح مصداق ہو کر یہ کہا کہ اے رب ہم نے اپنی فطری صلاحیتوں کا شکرانہ ادا نہ کر کے اور انہیں اعلیٰ مقاصد کیلئے بروئے کار نہ لا کر ان صلاحیتوں کے ساتھ بھی ناانصافی کی اور اپنے ساتھ بھی۔ ان فطری صلاحیتوں کے مزاج و خمیر میں جو پھیلنے اور بلند ہونے کی رحمت تھی۔ اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اب صحیح توبہ کے معنی یہی ہیں کہ اس کے ذریعے نئے دروازے کھلیں۔ شکرانہ کے طور پر نئے عزم، نئے حوصلے کے تحت زندگی، اپنے مقرر کردہ اعلیٰ نصب العین کی طرف قدم رکھے۔ یہ رحمتوں کی شناسائی اپنے ہی اندر پانی ہے۔ یہ کُن کا پھیلاؤ جوشِ نمود ہے۔ اپنے حُسنِ باطن کی خود آگہی کی پہلی جھلک ہے۔ دوسرے معنوں میں پہلی بسم اللہ ہے۔ ساتھ نام اللہ کے۔ تمام اسماء و صفات، خوبیوں اور صلاحیتوں پر بھروسہ ہے اور رحمت کو پہنچانتے ہوئے هُوَ مُحْكِم کا شکرانہ۔ اب اس محرک کیفیت میں زندگی گزارنی ہے کہ ساری کی ساری کائنات اسی رب العالمین کے دامنِ رحمت میں پل رہی ہے، پروان چڑھ رہی ہے جیسے ہی انسان اس شکرانۂ بندگی کی ادا کو پانے لگتا ہے۔ اس کے سب کام ایک ہی رخ اختیار کرنے لگتے ہیں۔ میرا رب وہ جس کا مجھ سے بلاواسطہ تعلق ہے، اس تعلق کا مضبوط ہونا تو خیر عاشقوں کے نصیب میں ہے مگر عام انسان کم از کم اتنا تو کرے کہ اپنی انانیت اور خودمختاری یا وہموں، وسوسوں، ظلمتوں سے نکل کر اپنے رب کی رحمت کو ہی اپنے اندر اور باہر کارفرما پائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا رب وہی جتنا اس کو شعور اور اس کے شکر کا احساس ہے، مگر جوں جوں اس کا شعور منزل بہ منزل لاشعور کے لاشعور تک ہم آہنگ ہوتا چلا جائے وہ اپنے رب کے ساتھ استحکام پکڑتا چلا جائے گا۔ اور اگر بے لگام ہو کر زندگی گزارنا چاہی تو شاید اِسے اپنی صلاحیتوں اور قدرتوں کے انعامات کا پتہ ہوتے ہوئے انہیں بروئے کار لانے کی تڑپ آ جائے مگر اپنی سطحی زندگی کی بناء پر اسے اپنے رب کا احسان ماننے کی نہ

طلب ہو گی۔ نہ فرصت نتیجتاً وہ ایسے کاموں میں لگا رہے گا جن کا انجام ناتمامی، نامرادی یا جھوٹی جھلک ہے، ارشادِ باری ہے کہ سوائے وجہی رب کے سب کو فنا ہے تو وہ چیز جس کی قدر و قیمت دائمی ہے وہ رب ہے۔ اپنے اندر اس رب کی آئینہ داری جن اقدار کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ان ہی کی قدر و قیمت دائمی ہے اور یہ سوائے اعلیٰ اقدار کے کیا ہوسکتی ہے۔ خلوصِ عمل، انہاکِ کار، جمعیّت بندی، خدمت، محبت، صداقت، شہادت، ولایت، رحمت وغیرہ ہی وجہی رب کی رونمائی کرتی ہیں۔ انہی کو اپنی مشعلِ راہ بنا کر جواب پا لے کہ میں کیا کروں! ان تمام اقدار کا تعلق جمعیّت سے ہے عالم انسانی سے یہ ہے۔ اپنے نفس اور لطیفۂ نفس کی سطح۔ اب مقامِ قلب میں آنے کی بات لگاؤ اور محبت کی یک رخی سے لے کر عشق کی وارفتگی اور بے ساختگی پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں اس سوال کا جواب اور بھی آسان ہو جاتا ہے کہ میں کیا کروں۔ بلکہ اس سوال کے پوچھنے کی یوں ضرورت ہی نہیں رہتی کہ خود بخود اس کی باطنی فطرت، محبوب کی تڑپ میں یک رخی قائم رکھتی ہے۔ بات بس عشق کے جاگنے کی ہے۔ عاشق کیلئے سب کچھ اِس کا محبوب، سب کچھ اس کے محبوب کیلئے۔ سب کچھ اس کے محبوب کے نام پر۔ اس لئے اس کا محبوب ہی اس کا رب ہے اور وہی حقیقی معنوں میں اس کی روح کی پرورش کرتا ہے۔ لہٰذا عاشق کو یہ بتانا کہ کیا کرے فضول ہے۔ اس کے لئے تعیّنِ راہ موجود ہے۔ اِلّا اَعلیٰ مقامات کے وہاں اٹھا ہی لیا جاتا ہے۔ رحمتوں کے سایوں میں پروان چڑھتا ہے۔ خود امرِ الٰہی کے اجراء کا ذریعہ بنتا ہے۔

کیا کروں کا مسئلہ تو ان ہی کیلئے کٹھن ہے۔ جن کی منازل مقامِ نفس تک ہی محدود ہیں۔ ان کے لئے تعیّنِ راہ کے ذرائع مذہب و ہدایت ہیں۔ یا فیضِ صحبت ان کا اصلِ حاصل یہ ہے کہ انسان کے ان ہی اعمال میں صداقت و خلوص اور دوام ہے۔ جو دوسروں کی خاطر ہوں، جمعیّت اور عالمِ انسانی کی خاطر ہوں۔ اُن کے لئے گھر، ماحول، مذہب، معاشرہ، مملکت ہی اجتماعی نظریہ کو فروغ دے سکتا ہے۔ وگرنہ فرد تو لاکھ پڑھ جائے یا ہنرمند و عقلمند ہو جائے اپنے اعلیٰ اقدار اور جمعیّت کی فلاح کی طرف خود بخود بہت ہی کم رجوع ہوسکتا ہے۔ چونکہ جمعیّت کی زندگی ہی میں فروغِ افراد ہے۔ اس لئے اب یہ سوال کہ میں کیا کروں ایک زیادہ

مستحکم صورت اختیار کر لیتا ہے کہ ہم کیا کریں۔ رب کے احسانات و انعامات کا شکرانہ اب وہ جمعیّت کی خاطر خلوصِ عمل سے ادا کر سکتا ہے۔ جمعیّت کیلئے جو کام کیا جائے اسے دوام بھی ہے اور بقا بھی۔

ہر فرد کیلئے ایک سادہ نفسیاتی نسخہ جو اللہ تعالےٰ نے خود بتایا ہے یہ ہے کہ ''جو شکر کرتے ہیں ہم انہیں زیادہ دیتے ہیں''۔ ایک حدیثِ مبارک بھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدھا گھڑا پانی آیا جو شکر گزار بندہ ہے وہ کہتا ہے آدھا بھرا ہوا ہے۔ اور جن میں شکایت کا جذبہ ہے وہ کہتے ہیں آدھا خالی ہے۔ اللہ نے ان اپنے انعام و اکرام پر جو اس نے انسان کے وجود میں خود عطا کئے ہیں اور جو ماحول اس کیلئے میسرّ کیا ہے بار بار توجہ دلوائی ہے اگر ان انعامات کی گنتی کرائی جائے یا بیان کی جائے تو سمندروں کے پانی کو روشنائی بنا کر ان انعامات و اکرام کو بیان کیا جائے تو بھی نہ لکھے جا سکیں۔ اپنے جسم کو ہی لیجئے جب ذرا سا ڈارھ میں درد یا گھٹنے پر ذرا سی چوٹ ہی لگ جائے تو ہم تڑپ اٹھتے ہیں مگر یہ کبھی خیال نہیں گزرتا کہ جو ساری عمر بغیر درد یا چوٹ کے گزار دی اس کے پس پشت کتنا بڑا نظام انسان کے باطن میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔ اس کی آگہی ہم کو یوں نہیں ہوتی کہ اس نظام میں ہم سے کوئی بیگانگی نہیں ہے۔ نہ ہی صرف وہ ہمارا ہمساز و ہمدم ہے بلکہ کوئی بیگانگی کا پردہ ہی نہیں رکھا۔ مگر یہ بھی کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم کو چونکانے کیلئے کبھی گھٹنے پر چوٹ لگا دی۔ کبھی کسی اور طرح ہمیں خود ہی اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ مصداق بالا حدیث اگر تمہاری ایک آنکھ پھوٹ گئی اور تم بجائے اس کے صدمے میں رونے کے اور ناشکری کو جگہ دینے کے جو آنکھ بچ گئی ہے اس کے سچے دل سے شکر گزار رہو تو قسم ہے اس ذات پاک کی کہ نہ ہی صرف وہ تمہاری پھوٹی آنکھ واپس آ جائے گی بلکہ تمہاری بصیرت کی آنکھ بھی روشن ہو جائے گی۔ (یہ تجربہ کی بات کہہ رہا ہوں) یہ تو ہوا ٹھوکر کھانے کے بعد ہوش میں آنا جب بھی ہوش میں آ جائے تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے، (کہ اس رحیم کریم کا رُخ تمہاری طرف ہے اور وہ تمہیں نظر انداز نہیں کر رہا، نہ ہی سزا دے رہا ہے۔) مگر حقیقتاً انسان کا مقام یہ نہیں ہے۔ یہ تو ایک جانور بھی ڈنڈے پڑیں تو سیدھا ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی سیدھا نہ ہوا تو حقیقتاً **اَسْفَلَ السافلین** سے ہے جو قہر کے روپ میں

احسان کو نہ دیکھے اور انعام کی بشارت نہ پائے اس پر بس اللہ رحم کرے۔ ہاں تو انسان کا کم از کم مقام وہ ہے جو عام زندگی میں کسی خاص تکلیف میں یا ابتلاء میں نہ ہو۔ جیسے غالباً نوے فیصد انسان ہیں۔ جن کے روزمرہ کے مشاغل میں زندگی اچھی خاصی گزر ہی جاتی ہے۔ ان کے لئے راستہ بہت سہل ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے انعامات پر جو تمہارے اندر اور تمہارے باہر ہیں۔ ان پر ایک لمحہ کیلئے غور کریں یہ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ایک منٹ کیلئے اپنے ہاتھ سے اپنے نتھنوں کو بند کرے اور سانس روک لے، جب دم گھٹنے لگے اور بے چینی شدّت پکڑے۔ تو ہاتھ چھوڑ دے اور پھر جو گہری سانس لے تو یہ سانس خود بخود بغیر الفاظ کے پکارتی ہے۔ شکر الحمد اللہ، شکر الحمد اللہ تو ذرا غور کرو، تم جو بغیر احساس کے سانس لئے جا رہے ہو اور اللہ تعالے نے جو پاک ہوا تمہیں دی ہے۔ اس کا کس زبان سے شکر یہ ادا کر سکتے ہو۔ کر کے دیکھو اور بار بار کر کے دیکھو یہ کوئی چلہّ کاٹنا نہیں ہے۔ بہت معمولی بات ہے اور جب یہ بات دل میں جم گئی تو پھر شکر گزار ہونے کے معنی تمہاری سمجھ میں آئیں گے اور دل پر نقش ہوں گے۔ اس کے بعد جیسے نئی نورانی دنیا تمہارے لئے کھل جائے گی۔

کچھ طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں، خصوصاً نسوانی طبقہ میں جو طبعاً ہمیشہ کمی کی طرف نظر رکھتی ہیں اور شکوہ شکایت ان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک دلچسپ نقل بے جا نہ ہوگی جو غوثؒ علیشاہ قلندر نے ارشاد فرمائی ہے۔ ایک بزرگ تھے اور اُن کی ایک محترمہ بیوی بھی تھیں۔ بیوی نے کہیں سن رکھا تھا کہ اور بزرگ ہوا میں اڑ کر کہیں جاتے ہیں تو اس نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ تم بھی بزرگ ہو۔ ہمیں کبھی اڑ کے نہیں دکھایا! انہوں نے کہا اچھا آج رات کو کوٹھے پر سو جانا اور دیکھ لینا۔ چاندنی رات تھی اور یہ آسمان کی طرف دیکھتی رہی دیکھا کہ ایک شخص ہوا میں اڑتا چلا جا رہا ہے۔ صبح میاں نے پوچھا کیوں بی بی دیکھ لیا نا۔ بیوی نے جواب دیا اچھا وہ تم تھے۔ میں جب ہی سمجھ گئی تھی میاں نے پوچھا وہ کیسے؟ تو بیوی نے جواب دیا، ٹیڑھے جواڑ رہے تھے۔ کہتے ہیں فقیر اور عاقل میں یہی فرق ہے۔ فقیر مطلوب کی ہر شے میں حُسن و خوبی دیکھتا ہے جو واقعی وہاں موجود ہوتی ہے اور سچ کہتا ہے، عاقل ہر شے میں اپنے معیار پر مبنی کوئی کمی یا کسر دیکھتا ہے اور اس سے متنبہ کرتا ہے اور وہ بھی سچ کہتا ہے تو بالا حدیث

کے معیار سے ناپا جائے تو فقیر ان بندوں میں آتا ہے جو شکر گزار بندے ہیں اور عاقل وہ جو گھڑے کو آدھا خالی دیکھتا ہے۔ دونوں ہی سچ کہتے ہیں مگر کتنا فرق ہے!

ہماری ابتلاؤں کو اپنے اعمال کی سزاؤں پر مضمر کرنا یا اپنے ان اعمال پر جن کو ہم نیک سمجھتے ہیں جزاء کی امید لگائے، بیٹھنا ایک نادانی کا پرتو ہے۔ اگر ہم جزا و سزا کے چکر میں پڑے رہے تو بہت گھاٹے میں رہیں گے چاہے جہاں تک ہمارا شعور کام کرتا ہے یا پیدائش سے موت تک ہم احکامِ الٰہی یا سنتِ نبوی سے ایک بال برابر بھی علیحدہ نہ ہوئے ہوں'' ہاں تو وہ کونسا راستہ ہے جو بے خوف وخطر ذمہ دار بنے گا، گارنٹی لے گا کہ **لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْن** یہ صرف رحمتوں کو انوار کی دنیا میں پانا ہے۔ سبقت رحمتی علیٰ غضبی۔ اور اس نورانی دنیا میں قدم رکھنے کا سب سے سہل اور لذت آفریں راستہ ہے شکر گزار بندہ بننا۔ بہ ظاہر یہ کٹھن سی بات معلوم ہوتی ہے کہ میری ایک آنکھ پھوٹ جائے یا میرے بڑھاپے کا اکلوتا فرزند اللہ تعالےٰ اٹھالے تو بھی میں شکر گزار رہوں۔ مگر اے بد بخت تیری دوسری آنکھ تو باقی ہے اور کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ اس کا شکر کیوں نہیں ادا کرتا! اور تو اپنے بڑھاپے کا سہارا اپنے لڑکے کو گردانتا ہے۔ توبہ کر توبہ! نہ رازق ہے۔ نہ وہ رب ہے۔ سہاروں کو چھوڑ اور جو دی ہوئی نعمتیں ہیں ان پر غور کر اور شکر گزار بندہ بن۔ اور تو دیکھے گا کہ واقعی یہ جذبہ، یہ بصیرت جب تیرے دل میں اتر جائے تو یک لخت تو ایسی روشنی میں آئے گا کہ انبساط سے تیرا جگر شق ہو جائیگا اور شکرانہ میں دل یہی پکار پکار کے کہے گا کہ سر کو سجدۂ شکر میں جھکا اور پھر عمر بھر نہ اٹھا۔ کر کے دیکھو، نہ عقیدے کی ضرورت ہے، نہ ایمان کی، چاہے تم کسی مذہب کسی فرقے سے بھی ہو۔ ایک دفعہ کر کے تو دیکھو۔ ہاں البتہ جب کسی آگ میں جل رہے ہو یا دردِ قولنج اٹھ رہا ہو۔ اسوقت ایسا خیال بھی کیوں آئے۔ ایسے وقت میں جب قولنج اٹھا ہوا ہو دوا کا کیسے خیال آجاتا ہے۔ صحت کی طرف کیسے خیال جاتا ہے۔ یہ مثبت پہلو کہاں سے ابھرتا ہے۔ یہ رحمت کی ٹپ ٹپ تمہارے اندر ہی موجود ہے۔ وہ خود بیتاب ہے۔ کیسا شُکر کا مقام ہے۔ ذرا سا شُکر کو موقع دو پھر دیکھو رحمت کھلتے کھلتے کس قدر شاندار شجر کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جس کی جڑیں نفس ہی میں مستحکم رہتی ہیں اور خدا جانے وہ درخت کہاں تک اوپر پہنچتا ہے!

اکثر لوگ جو روحانیت کی طرف مائل ہیں اور مالک کے کرم سے وہ کامیاب بھی رہے ہیں اور فتح بھی پائی ہے ان کی ابتداء عموماً کسی ایسی گہری ٹھوکر یا سانحہ سے ہوئی ہے جو قلب کی گہرائی تک کو ہلا گیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے عروج کی کوئی انتہا نہیں ہے جن میں شکرگزار ہونے کا جذبہ طبعًا موجود تھا اور اسی کی ربوبیت پر وہ پروان چڑھتے رہے۔ اَلَّذِیْنَ قَالُوْ رَبُّنا اللّٰہ وَاسْتَقَامُو عَلَیْہ۔ ان لوگوں نے اللہ کو رب کہا اور اس پر قائم ہو گئے۔ جب رب کو دیکھیں تو مزہ ہے۔ پھر یہ ظلمتیں ستاتی نہیں۔ اکثر طریقت کے راستوں میں نہ صرف یہ کہ اپنے نفس سے جہاد بلکہ سینکڑوں ظلماتی صورتوں سے واسطہ پڑتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ان ہی مجاہدوں میں اُلجھ کر زندگیاں صرف کر جاتے ہیں اور نورانی انبساط کی دنیا کی آرزو تو باقی رہ جاتی ہے مگر اس زندگی میں اللہ ہی رحم فرمائے تو یہ میسرّ آئے وگرنہ بعد کا حال تو وہی جانے، مگر یہ عجب کرشمہ اور عجوبہ ہے کہ وہ صرف زبان سے نہیں بلکہ رُوئیں رُوئیں سے شکر میں زندگی گزارتے ہیں ان کو واقعی نہ کبھی ڈاڑھ کا درد ہوتا ہے نہ گھٹنے پر ٹھوکر لگتی ہے۔ یہ تو عجب معجزہ ہے کہ باطن و ظاہر کائنات کا ہر ذرّہ اپنا دوست رکھتا ہے اور دوست کی خاطر سب کچھ نثار کرنے کیلئے بے چین معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت میں یہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ نہیں بلکہ یہ وہی رحمت للعالمینؐ کا پرتو معلوم ہوتا ہے۔ اگر رحمت کے معنی سمجھنے ہوں تو کچھ دن کے لئے ہی سہی، ایکٹنگ کر کے ہی سہی، شکرگزار بندے بننے کی کوشش کرو تو جیسے بچوں کی ایکٹنگ پر ماں، باپ مسکرا دیتے ہیں۔ اسی طرح تمہاری اس ایکٹنگ پر رحمت کِھل کِھلا کر ہنس پڑے گی اور تمہیں اپنی گودی میں لے لے گی۔

☆☆☆☆